"مودودی اسلام"

مرزا طاہر احمدؒ

"مودودی" اسلام

مرزا طاہر احمدؒ

مطبوعہ:- سن رائیز آرٹ پرنٹرز - لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

پیش لفظ

پاکستان آج کل ایک نہایت نازک دَور میں سے گذر رہا ہے اور مستقبل کے اُفق پر کئی قسم کے خطرات منڈلاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں، ہماری دُعا ہے، کہ اللہ تعالےٰ اپنے خاص فضل سے اس عظیم اسلامی مملکت کو ہمیشہ اپنی امان کے سایہ تلے رکھے اور ہر دن جو اس خداداد مملکت پر چڑھے فکروں کو دُور کرنے والا اور نئی خوشیوں کا پیغام بر ہو۔

ان خطرات میں جن کا ذکر آج کل زبان زد عام ہے ایک اہم خطرہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کہیں غیر اسلامی طاقتیں غالب آ کر اسلامی اقدار اور نظریات کو ملیامیٹ نہ کر دیں۔ اس مبیّنہ خطرے کی حقیقت کیا ہے یہ ایک ایسی بحث ہے جسے اس وقت چھیڑنا مقصود نہیں۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ عوام کو اُن گروہوں سے بھی متنبہ رہنا چاہیئے جو اس خطرے کے احساس کو ناجائز طور پر اپنے حق میں استعمال کرنے کی زبردست کوشش کر رہے ہیں۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ مودُودی جماعت ایسے ناجائز استفادہ کرنے والوں میں سرِ فہرست قرار دی جانی چاہیئے۔ کیونکہ آج [illegible] سے معصوم اور لاعلم مسلمان اس مبہم خطرہ کے پیشِ نظر جو مبیّنہ طور پر اسلام کو پیش آنیوالا ہے،

مودودی جماعت کے اس پراپوگنڈا سے متاثر ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں کہ اگر آج جماعت اسلامی کی حمایت نہ کی گئی تو نعوذ باللہ اسلام کی صف پاکستان سے لپیٹ دی جائے گی۔

واقعہ میرے نزدیک یہ ہے کہ مودودی جماعت باوجود اس کے کہ "اسلامی جماعت" کے دلکش عنوان کے تحت کام کر رہی ہے حقیقت میں اسلامی اقدار اور نظریات سے کوسوں دور ہے۔ اور اس جماعت کا سیاسی فلسفہ اشتراکیت اور مارکسیت کا مرہونِ منت تو قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر اسلام اور پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم سے اس فلسفہ کو کوئی بھی نسبت نہیں۔

آئندہ چند صفحات کے مطالعہ سے جو میری ایک کتاب "مذہب کے نام پر خون" سے ماخوذ ہیں قارئین خود بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ اسلام کے مودودی نظریہ کی حقیقت کیا ہے۔

والسّلام

خاکسار

مرزا طاہر احمد　　۷۰/۳/۹

ربوہ

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝

اشاعتِ اسلام

کے

دو نظریئے

منقول از

"مذہب کے نام پر خون"

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلّم کے اشاعتِ اسلام کے طریق کے بارہ میں دو نظریات پائے جاتے ہیں :-

(۱) معاندینِ اسلام کے نزدیک آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جنگیں جارحانہ جنگیں تھیں اور اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔

مگر

(۲) غیر جانبدار تحقیق یہ ہے کہ :-

حضرت رسُولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کبھی اشاعتِ اسلام کی غرض سے تلوار نہیں اُٹھائی ۔ اور آپ کی تمام جنگیں مدافعانہ جنگیں تھیں۔ اسلام پھیلا ہے تو محض آپ کی رُوحانی اور اخلاقی قوتوں سے !

اشاعتِ اسلام کے بارہ میں

مولانا مودودی اور بعض غیروں کے نظریات

ظلم کی حد یہ ہے کہ بعض مسلمان "رہنما" جبر و تشدد کے نظریہ کو صرف اپنی حد تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ ہمارے پاک آقا کو بھی اس میں ملوث کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُس کے دین اور اس کی قوتِ قدسیہ کو بھی اپنے کھوکھلے دلائل اور کرم خوردہ تُوتوں کی طرح ایسا کمزور جانتے ہیں کہ گویا اگر تلوار اس کے قبضۂ قدرت میں نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی وہ عظیم رُوحانی تبدیلی پیدا نہ کرسکتا جو عرب سے پھوٹنے والے اس رُوحانیت کے سرچشمہ نے چند سالوں میں کرکے دکھا دی تھی۔ اُن کے نزدیک اُس مظلوم نبیؐ کی دفاعی جنگیں محض اپنے مذہب کو پھیلانے کے لیئے ایک جارحانہ اقدام تھا اور اُس کی مکّی زندگی کا دَور محض ایک ناطاقتی کی دلیل تھی۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا مودودی نہایت واشگاف الفاظ میں رقم طراز ہیں:۔

"رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ۱۳ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے

رہے۔ وعظ و تلقین کا جو مؤثر سے مؤثر انداز ہو سکتا تھا اُسے اختیار کیا۔ مضبوط دلائل دیئے، واضح حجتیں پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت سے دِلوں کو گرمایا۔ اللہ کی جانب سے محیّر العقول معجزے دکھائے۔ آپ نے اخلاق اور پاک زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا، اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کے لئے مفید ہو سکتا تھا۔ لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت روشن ہو جانے کے باوجود آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا......

لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی تو دِلوں سے رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔ رُوحوں کی کثافتیں دُور ہو گئیں اور صرف یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردہ ہٹ کر حق کا نُور صاف عیاں ہو گیا بلکہ گردنوں میں وُہ سختی اور سروں میں وہ نخوت بھی باقی نہیں رہی جو ظہورِ حق کے بعد انسان کو اُس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اس سُرعت سے قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دُنیا مُسلمان ہو گئی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے اُن پردوں کو چاک کر دیا جو دِلوں پر پڑے ہوئے تھے۔

("الجہاد فی الاسلام" صفحہ ۱۳۷-۱۳۸)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ - یعنی وُہ گندہ اور سخت بھیانہ الزام جو اسلام کے

اشد ترین متعصب دشمنوں کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر لگایا جاتا تھا جسے یورپ کے یاوہ گو مستشرقین گذشتہ صدی تک عیسائی دنیا میں اُچھالتے رہے اور اسلام سے دلوں کو متنفر کرتے رہے وہی بہیمانہ الزام آج خود ایک مسلمان "رہنما" کی طرف سے اس مقدس رسولؐ کی پاک ذات پر لگایا جا رہا ہے۔ ایک ایسے رہنما کی طرف سے جسے "مزاج شناسِ رسولؐ" ہونیکا دعویٰ ہے۔ گو الفاظ کو میٹھا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ گو تلوار کی اس مزعومہ فتح کو پُر شوکت بنا کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر گولی وہی کڑوی اور ناپاک اور زہریلی ہے۔ یہ تیر وہی ہے جو اسلام کے دشمنوں کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چلایا جاتا رہا ہے۔ یہ پتھر وہی ہے جو اس سے پہلے جارج سیل اور سمتھ اور ڈوزی نے آنحضرت کی طرف پھینکا تھا۔ اور وہی ہے یہ الزام جو مسٹر گاندھی نے آں حضورؐ پر اُس وقت لگایا تھا جب وہ اسلام کی تعلیم سے ابھی پوری طرح آشنا نہیں تھے۔ اور محض دشمنانِ اسلام کی کہی ہوئی باتوں کو سن کر یہ تاثر قائم کر لیا تھا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی کے الفاظ ہیں:۔

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔"

اور ڈوزی کہتا ہے کہ:۔

"محمدؐ کے جرنیل ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لے کر تلقین کرتے تھے۔"

اور سمتھ کا دعویٰ ہے کہ جرنیلوں کا کیا سوال خود :-

"آپؐ ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں قرآن لیکر مختلف اقوام کے پاس جاتے ہیں"

اور جارج سیل یہ فیصلہ دیتا ہے کہ :-

"جب آپؐ کی جمعیت بڑھ گئی تو آپؐ نے دعویٰ کیا کہ مجھے ان پر حملہ کرنے اور بزورِ شمشیر بُت پرستی مٹا کر دینِ حق قائم کرنے کی اجازت منجانب اللہ مل گئی ہے"

ان سب دُشمنانِ اسلام کی آوازوں کو سُنیئے اور پھر مولانا مودُودیؔ کی مندرجہ بالا عبارت کا مطالعہ کیجیئے۔ کیا یہ بعینہٖ وُہی الزام نہیں جو اس سے پہلے بیسیوں دُشمنانِ اسلام نے رسُولِ معصُومؐ کی پاک ذات پر لگایا۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ناپاک اور بھیانک اور گھناؤنا۔ آپ دُشمنانِ اسلام کی تمام عبارتیں پڑھ کر دیکھ لیجیئے کہیں بھی آپ کو آں حضرتؐ کی قُوّتِ قُدسیہ کی مزعُومہ کمزوری اور معجزات کی ناطاقتی کا ایسا ہولناک نقشہ نظر نہیں آئیگا، جیسا مولانا مودُودیؔ کے الفاظ میں ہے۔ یعنی آپؐ کی مسلسل تیرہ سال کی دعوتِ اسلام جن دلوں کو فتح کرنے سے قاصر رہی تلوار اور جبروت نے اُن سے اپنا سکہ منوا کر چھوڑا۔ وعظ و تلقین کے مؤثر سے مؤثر انداز تو صحرائی ہواؤں کی نظر ہو گئے مگر نیزوں کی اَنی اسی پیغام کا پھریرا لیئے ہوئے دِلوں کی گہرائی تک اتر گئی۔ آپ کے "مضبوط دلائل" تو عقلِ انسانی میں جاگزین نہ ہو سکے مگر گُرزوں کی مار خود دِلوں کو توڑ کر ذہنوں کو قائل کر گئی۔ واضح بحثیں جس قُوّتِ

استدلال کو متاثر نہ کر سکیں، گھوڑوں کی ٹاپوں نے اُسے اسلام کی صداقتوں کے تمام راز سمجھا دیے۔ فصاحت و بلاغت بے کار گئی اور زورِ خطابت دلوں کو اس درجہ گرما نہ سکا کہ **اسلام** کا نُور اُن کے دلوں میں چمک اُٹھتا۔ حتیٰ کہ خود عرش کے خُدا کی طرف سے ظاہر ہونے والے محیّر العقول معجزے بھی بُری طرح خائب و خاسر رہے۔ اور ایک ادنیٰ سی پاک تبدیلی بھی پیدا نہ کر سکے۔ لیکن ''...... جب داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی ......'' إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۰ کس قدر مضحکہ خیز ہے یہ تصور اور کیسے تحقیر آمیز الفاظ ہیں کہ جن کو پڑھکر رونا آتا ہے کہ یہ ایک ''اسلامی رہنما'' کے قلم سے نکلے ہیں جو رسولؐ کی محبت کا دعویدار ہے۔ مولانا کے ان الفاظ کو پڑھیے اور ''میزان الحق'' کے کینہ توز مصنف پادری فنڈر کے اِن الفاظ کا مطالعہ کیجیے:۔

''اب حضرت محمدؐ تیرہ سال تک نرمی و مہربانی کے وسائل سے اپنے دین کی اشاعت میں کوشش کر چکے تھے ...... لہٰذا اب سے آں حضرتؐ اَلنَّبِیُّ بِالسَّیْف'' کہلائے یعنی نبیٔ تیغ زن بن گئے۔ اور اس وقت سے اسلام کی مضبوط ترین و کارگر دلیل تلوار ہی قرار پائی۔''[1]

''اگر ہم حضرت محمدؐ اور اُن کے تابعین کے چال چلن پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوگا کہ اب وُہ خیال کرنے لگ گئے تھے کہ عقبیٰ کے موضوع و مقبول اخلاقی قواعد کی پابندی ان کے لئے ضروری نہ تھی۔ اب خُدا

[1] میزان الحق۔ ص ۴۶۸۔

اُن سے فقط یہی ایک بات طلب کرتا تھا کہ اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اور تیغ و تیر اور خنجر و شمشیر سے قتل پر قتل کرتے رہیں[۱]"

اور اس کے بعد یہ مصنّف مسیح کی مظلومی کا بڑے فخر سے نعوذ باللہ حضرت رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مزعومہ جبر کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"آپ کو خداوند یسوع مسیح کلمۃ اللہ اور حضرت محمّد بن عبد اللہ (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) میں سے ایک کو پسند کرنا ہے۔ یا تو اُس کو پسند کرنا ہے جو نیکی کرتا پھرا یا اس کو جو النّبی بالسّیف کہلاتا ہے[۲]"

پھر مولانا مودودی کی تائید میں ایک اور اسلام دشمن مسٹر ہنری کوپی کے مندرجہ ذیل الفاظ پڑھیئے:۔

"۔۔۔۔۔۔۔ اور اپنی نبوت کے تیرھویں سال آپ نے اِس امر کا اظہار کیا کہ خدا نے مجھ کو نہ صرف بغرضِ مدافعت جنگ کرنے کی اجازت دی ہے بلکہ اپنا دین بزورِ شمشیر پھیلانے کی اجازت بھی دی ہے[۳]"

اُور ڈاکٹر اے سپرنگر کے یہ الفاظ پڑھیئے جو مولانا مودودی کی ہم خیالی میں اس رائے کا اظہار کرتے ہیں:۔

"اب پیغمبر (صلعم) نے فتنہ کے دفع کرنے کے لئے اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کا قانون خدا کے نام سے شائع کیا اور اس وقت سے یہ قاعدہ آپ کے (نعوذ باللہ) خونی مذہب کا نعرۂ جنگ ہو گیا[۴]"

---

[۱] میزان الحق صفحہ ۴۶۹، [۲] تتمہ میزان الحق، [۳] اہلِ عرب کی سپین کی تاریخ از ہنری کوپی جلد اوّل صفحہ ۳۹۔ مطبوعہ بوسٹن۔ ماخوذ از مقدمہ "تحقیق الجہاد" صفحہ ۳۱۔ [۴] ماخوذ از مقدمہ "تحقیق الجہاد" بحوالہ تاریخ محمدی صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ الہ آباد۔ ۱۸۵۱ء

کچھ تعجب نہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مذہب کے معاملہ میں جبر کا الزام لگانے والے سارے کے سارے وہ ہیں جو آپ کے اشد ترین دشمن ہیں اور بغض و عناد اُن کے سینوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے مگر تعجب بر تعجب ہے کہ اس معصوم اور مظلوم رسول کی پیروی کا دم بھر کر بھی کوئی کیونکر آپ کی مقدس ذات پر ایسے ہولناک وحشت اور بربریت سے بھرپور الزام لگا سکتا ہے۔

لیکن حیف ہے کہ مولانا مودودی کے نزدیک نہ کبھی پہلے اسلام میں یہ طاقت تھی کہ محض اپنے حسن و جمال سے تلوار کی مدد کے بغیر دلوں کو فتح کر سکے اور نہ آج یہ طاقت ہے۔ چنانچہ اپنے رسالہ "حقیقتِ جہاد" میں رقمطراز ہیں:

"کوئی ایک مملکت بھی اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمسایہ ملک میں بھی وہی اصول و مسلک رائج نہ ہو جائے۔ لہٰذا مسلم پارٹی کے لئے اصلاحِ عمومی اور تحفظِ خودی دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطہ میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوتیں ساتھ دیں اس نظام کو تمام اطراف میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک طرف اپنے افکار و نظریات کو دُنیا میں پھیلائے گی اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت دے گی کہ اس مسلک کو قبول کریں جس میں اُن کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہو گی وہ لڑ کر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی اور اُن کی جگہ اسلامی حکومت

قائم کرے گی "

اِس عبارت کو جناب مولانا صاحب کی پہلی عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے بے اختیار گاندھی جی کی یہ رائے ذہن میں اُبھر آتی ہے ۔ کہ :-

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہُوا ہے کہ اس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے"

اور آں حضرتؐ کی اِس مصنوعی خیالی تصویر کی طرف دھیان منتقل ہو جاتا ہے جو واشنگٹن اِرونگ نے اپنی تصنیف "سیرتِ محمدؐ" (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پہلے ہی صفحہ پر چھاپی ہے اور جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن لئے ہُوئے دکھایا گیا ہے ۔ اور معًا دل میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ مولانا کے نزدیک بھی اسلام اور اس کے مقدس رسولؐ کا تصور واشنگٹن ارونگ کے تصوّر سے کچھ مختلف نہیں ہے ۔

پس ایک طرف تو یہ مسلمان عالِم ہے کہ دُنیا کے معصوم ترین نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اشد ترین مخالفین کا ہم نوا ہو کر ظلم و تعدی اور جبر و استبداد کا الزام لگا رہا ہے ۔ اور دُوسری طرف ہمیں بیشمار ایسے انصاف پسند غیر مسلم مفکرین کا گروہ نظر آتا ہے جو باوجود شدید اختلافات کے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہرگز تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ ظاہری و باطنی حُسن اور عظیم اخلاقی قوّت کے زور سے دِلوں پر فتحیاب ہوا ۔ چنانچہ مولانا اور معاندینِ اسلام کے مندرجہ بالا اقتباسات کے بعد بے محل نہ ہوگا اگر ہم بعض انصاف پسند غیر مسلموں کی رائے بھی پیش کر دیں ۔ یہ سب کے سب اسلام کے

حامی و مداح نہیں ہیں بلکہ بعض ایسے بھی ہیں کہ خفیف سے خفیف موقع سے فائدہ اُٹھا کر بھی اسلام پر حملہ کرنے سے نہیں چُوکتے ۔ مگر آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دفاعی جنگوں پر گہری تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد انھیں بے اختیار یہ تسلیم کرنا پڑا کہ :۔

"اکثر متعصب مخالفین اسلام خصوصاً گمراہ کُن پروپگنڈا کرنے اور مُلک میں آتشِ فتنہ و فساد کے بھڑکانے والے کہا کرتے ہیں کہ حضرت محمدؐ صاحب مدینہ جاکر طاقت و قوت حاصل کرکے اپنی اس بناوٹی تعلیم رحم و مروّت کو باقی نہ رکھ سکے بلکہ اپنی زندگی کے اہم مقصود (طلبِ دُنیا ، حکومت و مرتبہ، مال و دولت وغیرہ) کے حصُول کے لئے بڑے زور کے ساتھ تلوار و قوت کا استعمال کیا ۔ بلکہ ایک خونی پیغمبر بن کر دُنیا میں تباہی و بربادی مچائی اور اپنے اس بناوٹی صبر وضبط کے معیار سے گر گئے ۔ لیکن یہ ان کوتاہ بین مخالفوں کی (جن کو خواہ مخواہ کا بُغض اسلام اور مسلمانوں سے ہے) تنگ نظری اور بکپاشت رُوپی اگیان کا پردہ جو اُن کی نگاہوں پر پڑا ہُوا ہے اور بجائے نُور کے نار ۔ حُسن کے قبح ۔ اچھائی کے بُرائی ہی تلاش کرتے رہتے ہیں اور ہر ایک خوبی کے اعلیٰ مرتبہ و تعلیم کو ایسی بُری شکل و صُورت میں پیش کرتے ہیں جن سے اُن کی بدباطنی اور سیاہ قلبی کا بخوبی پتہ چلتا ہے[۱]۔

یہ اقتباس ایک غیر مُسلم مقرّر جناب پنڈت گیانیندر صاحب دیو شرما شاستری

---

[۱] دُنیا کا ہادیٔ اعظم غیروں کی نظر میں صفحہ ۵۷ ۔

کی ایک تقریر سے لیا گیا ہے جو انھوں نے ۱۹۲۸ء میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت پر گورکھ پور میں فرمائی تھی۔ کچھ آگے چل کر یہی پنڈت صاحب اسلام کی فیصلہ کُن طاقت کے بارہ میں اپنی تحقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :-

"مخالفین اندھے ہیں۔ اُن کو نظر نہیں آتا کہ محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ ناقل) کی تلوار رحم و مروّت تھی۔ دوستی اور درگذر تھی جو مخالفین پر پورے طور پر کارگر ہوتی اور اُن کے قلب کو پاک و صاف کر کے مثلِ آئینہ بنا دیتی۔ جس کی کاٹ اس مادی تلوار سے بڑی زبردست اور تیز ہوتی"[1]

اِس اقتباس کے بعد کسی رائے زنی یا موازنہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر دل سے بے اختیار یہ آہ نکل جاتی ہے کہ کاش مولانا مودودی اپنے "آقاؐ" کے بارہ میں اتنے ہی انصاف سے کام لیتے جتنا کرشن کے ایک غلام نے لیا ہے۔ ایک نہیں بلکہ بیسیوں حضرت کرشن کے غلاموں نے جب تاریخ اسلام پر غور کیا۔ اور ہمارے آقا کا حُسن اُن پر آشکارا ہُوا تو یہ کہے بغیر اُن سے بن نہ پڑی کہ :-

"لوگ کہتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا۔ مگر ہم اُن کی اس رائے سے موافقت کا اظہار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ زبردستی سے جو چیز پھیلائی جاتی ہے وہ جلدی ظالم سے واپس لے لی جاتی ہے۔ (تعجب ہے کہ مولانا کی نظر "مزاج شناسِ نبوّت" انسانی فطرت کے اس ظاہر و باہر نکتہ کو بھی نہ پا سکی۔ ناقل) اگر اسلام کی اشاعت ظُلم کے ذریعہ ہوئی ہوتی تو آج اسلام

---

[1] "دنیا کا ہادیٔ اعظم غیروں کی نظر میں" صہ ۹۱۔

کانام ونشان بھی باقی نہ رہتا لیکن نہیں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام دن بدن ترقی پر ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ بانیٔ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) کے اندر روحانی شکتی تھی منش ماتر (بنی نوع انسان) کے لئے پریم تھا۔ اس کے اندر محبت اور رحم کا پاک جذبہ کام کررہا تھا۔ نیک خیالات اسکی رہنمائی کرتے تھے۔[1]"

مگر مولانا صاحب پھر بھی مُصر ہیں کہ اسلام کی فیصلہ کُن طاقت آپ کی معجزانہ زندگی میں نہیں بلکہ تلوار میں مضمر تھی۔ حسرت اور پھر حسرت ہے کہ آپؐ کی مقدس زندگی کا وُہ معجزہ جو ایک غالی آریہ کی نظر سے بھی اوجھل نہ رہ سکا "مولانا" کی پُر بصیرت آنکھ اُسے دیکھنے سے محروم رہ گئی۔ "آریہ مسافر" کی اسلام دُشمنی سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ آریہ مذہب کا وُہ ترجمان تھا جو ہمیشہ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ رہا۔ مگر جب اس کے ایک مقالہ نویس نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ کی وجوہ پر غور کیا تو تلوار کی قوت کے الزام کو ایک فرسُودہ اور بودے اتہام کے طور پر ٹھکرا دیا۔ اور آپ کے غلبہ کی وجہ محض یہ قرار دینے پر مجبُور ہوگیا کہ آپ کی زندگی ایک مجسم معجزہ تھی۔ چنانچہ وُہ لکھتا ہے اور انسانی فطرت کی یہ کیسی سچی اور پاک گواہی ہے کہ :-

"وہ شخص جس نے قریش کو ایمان کا جامِ شہادت پلایا ایک معجزہ تھا...... اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) کی زندگی ایک معجزہ نہ ہوتی تو کون ہم کو ولید (غالباً خالدؓ بن ولید مراد ہیں۔ ناقل) کی

---

[1] از قلم ایڈیٹر "ست اُپدیش" لاہور مؤرخہ ۷ جولائی ۱۹۱۵ء۔ ماخوذ از برگزیدہ رسُول غیروں میں مقبول" صفحہ ۱۲ و ۱۳۔

بے غرضانہ خدمات سے مستفید کرتا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ناقل)
نے جوشِ ایمان کا دریا موجزن کیا۔ اور عرب کی جنگلی آبادی کو ایک واحد
خدا کا پرستار بنا دیا۔[۱]"

پھر لاہور میں ہونے والے آریہ سماج کے ایک جلسہ میں پروفیسر رام دیو صاحب
سابق پروفیسر گوروکل کانگڑی وایڈیٹر ویدک میگزین نے ہمارے آقا و مولا محمدِ
عربی صلّی اللہ علیہ وسلم پر لگائے جانے والے اس مکروہ اتہام کو غلط قرار
دیتے ہوئے کہ آپؐ نے اسلام تلوار سے پھیلایا تھا۔ ان الفاظ میں اپنی
تحقیق کا اظہار کیا:۔

"لیکن مدینہ میں بیٹھے ہوئے محمد صاحب (صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ ناقل) نے
اُن میں جادو کی بجلی بھر دی۔ وُہ بجلی جو انسانوں کو دیوتا بنا دیتی ہے۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ غلط ہے کہ اسلام محض تلوار سے پھیلا
ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اشاعتِ اسلام کے لئے کبھی تلوار نہیں
اُٹھائی گئی۔ اگر مذہب تلوار سے پھیل سکتا ہے تو آج کوئی پھیلا کر
دکھا دے۔[۲]"

اِس آخری فقرہ میں کیسی لازوال سچائی بھری ہوئی ہے۔" اگر مذہب تلوار سے
پھیل سکتا ہے تو آج کوئی پھیلا کر دکھا دے۔" ہمارے مقدّس آقا صلّی اللہ
علیہ وسلّم پر جبر کا الزام لگانے والوں کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ اور ایک چیلنج

[۱] "آریہ مسافر" اکتوبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۲ و ۳ بحوالہ "برگزیدہ رسول غیروں میں مقبول۔ ص۲۱،
[۲] اخبار پرکاش بحوالہ "برگزیدہ رسول غیروں میں مقبول" ص۲۴؛

ہے اور مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس نے مذہب کو پیدا کیا کہ جب سے سلسلۂ نبوت جاری ہوا ہے نہ کبھی پہلے کسی جابر متشدد نے اس چیلنج کا جواب دیا نہ آج دے سکتا ہے اور نہ کبھی آئندہ دے سکے گا۔ ایک مودودی نہیں پچاس کروڑ مودودی بھی مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیکھیں تب بھی فقط ایک انسان کے دل سے بھی تلوار کی قوت سے اس کا مذہب نہیں نکال سکتے۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ اِس بات کے گواہ ہیں کہ اُن کے مخالفین کی طرف سے مذہب کو بزور تبدیل کرانے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ تلوار اُٹھائی گئی مگر ہر بار خائب و خاسر رہی۔ وہ ہاتھ شل ہو گئے اور وُہ تلواریں ٹوٹ گئیں اور مذہب اُنکے سائے تلے بے خوف پھیلتا اور پھولتا اور پھلتا رہا۔ پھر ان سب نبیوں کے سردار کو کب شایاں تھا کہ اس معصوم گروہ کے کامیاب طریقۂ تبلیغ کو چھوڑ کر ناکام ظالموں کا وطیرہ اختیار کرتا۔ نہیں نہیں ایسا مت کہو کہ یہ میرے آقا پر توڑے جانے والے سب ظلموں سے زیادہ ظلم ہے اور ایسا صریح ظلم ہے کہ غیر بھی بے اختیار پکار اُٹھے کہ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ چنانچہ موسیو اوجین کلوفل نے آپؐ کے متعلق لکھا:-

> "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) نے تمام دُنیا کو فتح کرنا اور اسلام کا بول بالا کرنا چاہا۔ مگر غیر مذاہب والوں پر کسی قسم کا جبر و ستم کرنا روا نہیں رکھا۔ اُن کو مذہب اور رائے کی آزادی عطا کی اور اُن کے تمدنی حقوق قائم رکھے۔"[1]

---

[1] "اسلام اور علمائے فرنگ" صفحہ ۹ بحوالہ "برگزیدہ رسول غیروں میں مقبول" صفحہ ۱۱۔

مسٹر گاندھی کو بھی جن کی فراست بڑی گہری تھی مزید تحقیق کے بعد آخر اپنی اس رائے کو تبدیل کرنا پڑا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کی ایک اشاعت میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ :-

"میں جُوں جُوں اس حیرت انگیز مذہب کا مطالعہ کرتا ہُوں حقیقت مجھ پر آشکارا ہوتی جاتی ہے کہ اسلام کی شوکت تلوار پر مبنی نہیں"

اور ڈاکٹر جی ڈبلیو لائیٹنر نے بھی خود قرآن ہی سے اس الزام کی تردید میں ایک مضبوط استدلال کرتے ہُوئے لکھا :-

"فی الواقع ان لوگوں کی تمام دلیلیں گر جاتی ہیں جو محض اس بات پر قائم ہیں کہ جہاد کا مقصد تلوار کے ذریعہ سے اسلام کا پھیلانا تھا۔ کیونکہ بخلاف اس کے سُورۂ حج میں صاف لکھا ہے کہ "جہاد کا مُدعا مسجدوں اور گرجاؤں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور زاہدوں اور عابدوں (تپشیروں) کی خانقاہوں (تپشیا شالاؤں) کو بربادی سے محفوظ رکھنا ہے"[۱]

پس تلوار کے زور سے اسلام پھیلانے کا الزام لگانے والوں سے مَیں خود قرآن ہی کے الفاظ میں پُوچھتا ہُوں "اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا" ـــــ "کیا وُہ قرآن پر غور نہیں کرتے ؟ یا دلوں پر تالے پڑے ہُوئے ہیں !" ـــــ

مگر مولانا کو کون سمجھائے کہ وُہ اِس دعویٰ پر مُصر ہیں اور ببانگ دہل

۱؎ "ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو" اکتوبر ۱۸۸۶ء ؛

مصر ہیں اور فنڈر اور سیل اور ہنری کوپی اور سمتھ اور ڈوزی اور سپرنگر کی ہم نوائی میں مصر ہیں اس اعلان پر کہ :-

"یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اسی کو زیرِ نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول اور مسلک کی طرف دعوت دی۔ مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔ آں حضرت کے بعد حضرت ابوبکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انھوں نے روم اور ایران دونوں غیر اسلامی حکومتوں پر حملہ کیا اور حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔"[۱]

اگر یہ تحریر کسی اشتراکی تواریخ نویس کی ہوتی اور یہ پالیسی مارکس یا لینن یا سٹالن کی طرف منسوب کی جاتی اور "مسلم پارٹی" کی جگہ "کمیونسٹ پارٹی" کے الفاظ ہوتے تو مجھے کچھ تعجب نہ ہوتا اور میں بغیر کسی قلبی ہیجان کے اس عبارت کو پڑھ کر آگے گذر جاتا اور خیال بھی نہ کرتا کہ کسی نے کیا لکھا ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک مسلم راہنما کی تحریر ہے جو واشگاف الفاظ میں اس مقدس ذات پر یہ اتہام لگا رہا ہے جس کی غلامی کا دعویٰ کرتا ہے۔

[۱] "حقیقت جہاد" ص ۶۵

یہ مولانا مودودی کی تحریر ہے ...... الفاظ واضح اور غیر مبہم ہیں۔ الزام سخت گھناؤنا اور ننگا ہے۔ اور صرف ایک الزام نہیں بلکہ الزام پر الزام لگایا گیا ہے۔ اِس تحریر کا پڑھنا بھی مجھ پر سخت گراں ہے اور لکھنا بھی۔ ناقابلِ بیان اذیت پہنچتی ہے جب اس فقرہ پر نظر پڑتی ہے کہ دعوتِ اسلام تو بھیجی مگر:۔

"اِس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں۔ بلکہ قوّت حاصل کرتے ہی رُومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا ......"

آں حضرت صلّی اللہ علیہِ وآلہٖ وسلّم کی پالیسی تو ایک معصومانہ پالیسی تھی جو ایک نوزائیدہ بچّے کے دِل کی طرح پاک وصاف تھی۔ آپؐ نے تلوار اسی وقت اُٹھائی جب آپؐ پر حد سے بڑھ کر مظالم توڑے گئے اور صرف اسی وقت اُٹھائی۔ آپ کے ہاتھ سلامتی کے ہاتھ تھے اور جارحیّت کی تلوار سے سراسر ناآشنا تھے۔ شریف النفس غیروں نے بھی جب آپ کی اس پالیسی پر نگاہ کی تو اُسے کُلّیۃً سلامتی اور امن اور دفاع کی پالیسی قرار دیا چنانچہ مودودی صاحب کے مندرجہ بالا الفاظ پڑھنے کے بعد اب ایک سکھ معاصر کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

"ابتدا میں آں حضرتؐ کے مخالفین نے جب آپ کا جینا اجیرن بنا دیا تو آپ نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ اپنا وطن چھوڑ کر مدینے چلے جاؤ۔ یعنی اپنے کسی ہم وطن بھائی پر ہاتھ اُٹھانے کی بجائے حضور نے اپنا پیارا وطن چھوڑنا منظور کر لیا۔ لیکن آخرکار جب اُن پر ظلم اور

جبر کی حد کر دی گئی تو مجبوراً آپ نے اپنی اور اسلام کی حفاظت میں
تلوار اُٹھائی۔ .... یہ پرچار کہ دین کی اشاعت
کے لئے جبر کرنا جائز ہے اُن احمق لوگوں کا عقیدہ ہے جنھیں نہ دین
کی سمجھ ہے نہ دنیا کی۔ وہ حقیقی سچائیوں سے دُور ہونے کی وجہ سے
اس غلط عقیدہ پر فخر کرتے ہیں[1]۔"

اِس پر مَیں کوئی مزید تبصرہ نہیں کرتا۔ قارئین کا دِل خود گواہی دے گا کہ
دونوں میں سے کون سچّا ہے، ایک سکھ جریدہ نگار یا "مزاجِ شناسِ نبوت"؟

---

[1] "نواں ہندوستان" دہلی۔ اشاعت ۱۷ر نومبر ۱۹۴۷ء

اشاعتِ اسلام پر جبر کا الزام

تاریخی شواہد کی روشنی میں!

گذشتہ باب میں مولانا مودودی کا جو اقتباس نقل کیا گیا ہے (لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیِ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی ....) یہ ان کی کتاب "الجہاد فی الاسلام" سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے انسان بغیر کسی دقت کے اس نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس کا فکر اس کے ذاتی رجحانات اور قلبی کیفیات کا تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل ایک منصف اور قاضی کے طور پر عطا فرمائی ہے۔ جو اس کے جذبات اور علم پر یکساں عدل کو جاری کرتی ہے۔ اور اگر ایک طرف ان دونوں کو ایک دوسرے پر ناجائز دسترس سے باز رکھتی ہے۔ تو دوسری طرف ان کے اندرونی توازن کو بھی قائم کرتی ہے۔ لیکن اگر کسی کی نظر و فکر کا یہ قاضی غلط تربیت کی بنا پر غیر منصف ہو یا آزاد نہ رہ سکے اور خود اپنے ہی جذبات کا غلام ہو کر رہ جائے تو ایسے شخص کی ذہنی دنیا میں ایک انتشار، لاقانونی اور بدنظمی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اگر یہ غیر آزاد اور غیر منصف عقل کسی ایسے شخص میں پائی جائے

جو جاہلِ مطلق یا جذبات سے بالکل عاری ہو تو انسان کو بحیثیتِ اجتماعی اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ مگر جس قدر بھی ایسے شخص کے پاس علمی مواد زیادہ ہو یا جذبات کی فراوانی ہو اُسی قدر یہ غلط نتائج اخذ کر کے دنیا کے لئے ایک مصیبت اور ابتلاء کا موجب بن سکتا ہے۔ کبھی تو یہ اپنے جذبات کا غلام بن جاتا ہے اور کبھی ظاہری علم کا۔ کبھی ایک بھٹکتے ہُوئے شاعر یا ایک جنونی کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے کبھی ایک خشک فلسفی یا رُوحانیت سے عاری عالم کے رُوپ میں۔ پس ان میں سے ہر صُورت بنی نوعِ انسان کے لئے بے پناہ مُصیبت کا پیغام لے کر آتی ہے۔

مولانا مودُودی کی بعض کتب مثلاً "الجہاد فی الاسلام" کے مطالعہ سے بدیہی یہ تأثر قائم کیا ہے۔ کہ اُن کے ہاں عقل کا قاضی آزاد نہیں بلکہ مخصوص ذاتی رُجحانات کا تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ اپنے مہیّا شدہ علمی مواد سے جو نتائج اخذ کرتے ہیں وہ سخت مضطرب بلکہ باہم بر سرِ پیکار ہیں۔ اسلام سے متعلق مولانا پہلے ہی سے یہ تہیّہ کئے بیٹھے ہیں کہ اس مذہبِ معصوم کو اگر پھیلایا جا سکتا ہے تو تلوار کے زور سے۔ مگر مشکل درمیان میں یہ درپیش ہے کہ اوّل تو قرآن اس نظریہ کا مخالف اور آں حضرت صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے خلاف ہے۔ دُوسرے غیروں کی نظر کا کچھ کچھ ڈر راہ میں حائل کہ وُہ کیا کہیں گے۔ مولانا عجیب تذبذب میں مبتلا ہیں جو چاہتے ہیں وُہ پُوری طرح کہہ نہیں سکتے اور جو کہہ سکتے ہیں وُہ دل کی پوری آواز نہیں۔ اِسی اُلجھن میں پھنس کر مولانا نے ایک پیچ در پیچ طریق مافی الضمیر

کے اظہار کا نکالا ہے ۔ زیر بحث کتاب یعنی "الجہاد فی الاسلام" میں ابتدا تو اس دعویٰ سے کرتے ہیں کہ اسلام مذہب میں جبر کو روا نہیں رکھتا ۔ مگر انتہا اس کے بالکل برعکس دعویٰ پر جاکر ہوتی ہے ۔ اس کتاب کے شروع میں سارا زور یہ ثابت کرنے پر صرف کیا گیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگیں دفاعی جنگیں تھیں ۔ اور ان کی غرض یہ تھی کہ انسان کی آزادیٔ ضمیر کے حق کو قائم اور محفوظ کیا جائے ۔ جبر و تشدّد کے ذریعہ اسلام کو دبانے کے لئے مخالفین کی تمام ناپاک کوششیں ناکام بنا دی جائیں اور حق کو اُن کی عائد کردہ قیود سے آزاد کیا جائے ۔ مگر آخر یہ زورِ قلم مساواتِ ضمیر اور انصاف کی سب لگامیں تڑا کر آزاد ہو جاتا ہے ۔ اور جب دُوسرے مذاہب اور دُوسرے انسانوں کے حقُوق کا سوال پیدا ہوتا ہے تو بعینہٖ برعکس مسلک پر جولانی دِکھانے لگتا ہے ۔

ایک قدم آگے

شروع میں اگرچہ یہ پڑھ کر ایک مُسلمان کا دِل فرطِ مسرّت سے لبریز ہو جاتا ہے کہ بڑا ہی پاک ہے یہ مذہب جو فطرتِ انسانی کے عین مطابق ایسی منصفانہ اور پُرامن تعلیم دیتا ہے اور آزادیٔ ضمیر کا اس جُرأت اور بے باکی کے ساتھ اظہار کرتا ہے ۔ لیکن افسوس کہ یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی ۔ اور مودُودی صاحب یہاں پہنچکر معًا پینترا بدلنے لگتے ہیں اور استدلال کا سارا دھارا اِس طرف پھر جاتا ہے کہ کسی طرح اسلام کے ساتھ تشدّد کے نظریات کو کَس کَس کر باندھ دِیا جائے ۔ اور استدلال کی کوئی ایسی کُنجی تلاش کی جائے جو کم از کم اسلام کے لئے جبر و تشدّد کے سب خُونیں باب کھول دے ۔ آپ یہ پڑھکر حیران تو ضرور ہوں گے کہ

اگر پہلے ایک بار تسلیم کر لیا گیا کہ اسلام کی جنگیں محض خود حفاظتی کی جنگیں تھیں
اور مذہب میں جبر کے استعمال کے خلاف ایک عملی احتجاج کے طور پر تھیں -
تو پھر اسی سانس میں یہ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے کہ خود اسلام ہی مذہب
کے نام پر کسی قسم کا جبر روا رکھتا ہے - یہ سمجھنا آپ کے اور میرے لئے مشکل ہو
تو ہو مگر مودودی کے لئے کچھ مشکل نہیں - چنانچہ اس مقام پر اس امر کی پوری
تسلّی کر لینے کے بعد کہ اسلام پر جبر کا الزام لگانے والے معترضین کا مُنہ دندان
شکن جواب دے کر بالکل بند کر دیا گیا ہے - اب اپنوں میں بیٹھ کر دل کی بات
کا اظہار شروع کر دیتے ہیں اور ایک حیرت انگیز قلب ماہیت (Trans-
formation) میں سے گذرتے ہوئے قرآن و حدیث کو من مانے معنی
پہنا کر اور ناقابل وجوہ جواز پیش کر کے آخر اس نتیجہ تک جا ہی پہنچتے ہیں کہ
مسلمان بنانے کے لئے تو جنگ بہر حال جائز نہیں مگر بُری باتوں سے روکنے
کے لئے جائز بلکہ فرض ہے - چونکہ غیر اسلامی ممالک اور تمدّن میں بُری
باتیں ہوتی ہی ہیں اس لئے اسلام ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اپنے
مُلک میں آپس میں بُری باتیں کرتا رہے - اس جبر کو تو انسانی آزادی میں
دخل نہیں کہا جا سکتا - کیونکہ اسلام پھیلانے سے اس کا کوئی تعلّق نہیں - بلکہ یہ
تو محض بُری باتوں سے روکنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے -

ایک اَور قدم آگے

یہ فرما کر مولانا اپنے ذاتی رُجحانات کے
بہت قریب آجاتے ہیں مگر ابھی دل
کی پُوری بات نکلی نہیں - بھلا اس میں کیا لُطف ہوا کہ کسی کو بزورِ شمشیر بُری

باتیں کرنے سے منع کر کے انسان اپنا رستہ پکڑ لے۔ جب ایک دفعہ بُری باتوں سے روکنے کی غرض سے تلوار ہاتھ میں پکڑ ہی بیٹھے تو پھر کیا اسی پر بس کر دیں گے؟ نہیں۔ بلکہ اس کی کوئی اور غرض ہونی چاہیئے۔ اور وہ غرض ڈھونڈنی بھی کچھ مشکل نہیں۔ اگر قرآن کریم کی صرف ایک آیت کو محل سے بے محل کر کے اُسے حسب منشاء معانی پہنا دیئے جائیں تو بآسانی ایسا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہی آسان راستہ اختیار کرتے ہوئے مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ" میں اس قتال کی غرض و غایت کو بیان کر دیا گیا ہے (جس قتال کو بُری باتوں سے روکنے کی غرض سے شروع کیا گیا تھا۔ ناقل) اگر حَتّٰی یُسْلِمُوْا کہا جاتا تو البتہ غایت قتل یہ ہوتی کہ انہیں تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے۔ لیکن حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ نے بتا دیا کہ ان کا ادائے جزیہ پر راضی ہو جانا قتال کی آخری حد ہے۔ اور اس کے بعد پھر ان کی جان و مال پر کوئی حملہ نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں[1]۔"

قارئین اب تک میرے اس تمہیدی بیان کا مطلب بخوبی سمجھ چکے ہوں گے کہ ایک غیر آزاد عقل کو جب علم پر کچھ دسترس حاصل ہو تو وہ دنیا کے سامنے عجیب متضاد اور مہلک نتائج پیش کرتی ہے۔ تمسخر کی حد ہے کہ ابتدا تو اس بیان سے شروع ہوتی ہے کہ اسلام ایک آزادئ ضمیر کا حامل مذہب ہے اور اسلامی جنگوں کی غرض صرف یہ تھی کہ مخالفین کی طرف سے مذہبی آزادی کچلی جا رہی

[1] "الجہاد فی الاسلام" صـ ۹۳؛

تھی ۔ وسط میں جاکر یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ دراصل اسلام کے دو حصے ہیں
اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا ۔ بزور اچھی باتوں کا حکم دینا تو
چونکہ آزادئ ضمیر کے خلاف ہے ۔ اس لئے اسلام ایسا نہیں کرتا ۔ مگر بری باتوں
کو چونکہ کسی صورت برداشت نہیں کرسکتا اس لئے دنیا کے کونے کونے سے
بری باتوں کو بزورِ شمشیر مٹانے کے لئے جنگ کا حکم دیتا ہے ۔ اور آخر پر نتیجہ
اس کا یہ نکلتا ہے کہ چونکہ بری باتوں کو مٹانے کے لئے جنگ کی گئی تھی ۔ اسلئے
اسلام جزیہ لے کر راضی ہوجاتا ہے ۔ اور پھر ان کی جان و مال پر کوئی حملہ نہیں
کیا جاسکتا خواہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں"۔ یہاں پہنچ کر مولانا کو نصف اسلام
یعنی بری باتوں سے روکنا بھی بالکل بھول جاتا ہے ۔ کیونکہ جزیہ مل گیا ۔ اور
اصل غرض و غایت پوری ہوگئی ۔ چنانچہ یہ ذکر کرنا بھی یاد نہیں رہتا کہ اس جگہ
اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے سے کیا مراد ہے ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
دونوں یا دونوں میں سے ایک یا کوئی نہیں ۔

آخری چھلانگ

لیکن ابھی تک بھی مولانا اپنے مافی الضمیر کو پوری
طرح ادا نہیں فرماسکے ۔ اور ایک آخری چھلانگ
لگانی باقی ہے ۔ مودودی فکر یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ اشاعتِ اسلام کو تلوار سے
کوئی واسطہ نہ ہو اور تشدد کے بغیر بھی کوئی مذہب دنیا میں پھیل سکے ۔ چنانچہ
قتال کی غرض و غایت جزیہ حاصل کرنا بیان فرماکر یہ ثابت فرمانے کی کوشش کرتے
ہیں کہ اشاعتِ اسلام کے لئے تلوار بہرحال ناگزیر تھی ۔ چنانچہ انگریزی کے
اس محاورہ کے مطابق کہ "بلی تھیلے سے باہر نکل آئی" (Cat is out

of the bag) دِل کی بات اُچھل ہی پڑتی ہے۔ اور مولانا اچانک آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے مقدّس نام پر اس الزام کے ساتھ جست لگاتے ہیں "لیکن جب معجزات کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے تلوار ہاتھ میں لی ...." اور معًا وہ سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں جو اب تک سینہ میں دبا پڑا تھا۔ (افسوس کہ اس مقام سے پہلے اگر مولانا کے قدم تمسخر کی حدود میں اُٹھ رہے تھے تو اس چھلانگ کیساتھ ہی صریح ظُلم وستم کی حد میں داخل ہوجاتے ہیں) اور اپنے مخصوص رنگ میں رات کو دِن اور دِن کو رات بتاتے ہوئے اشاعتِ دین کے اس خونی تصوّر کو عین راستی اور حق دِکھاتے ہیں۔ آخری نتیجہ ان تمام سیاہ کیئے ہوئے صفحات کا یہ نکلتا ہے کہ:-

"جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصّہ نہیں ہے[1]"

کچھ دیکھا آپ نے کہ کہاں سے چلے تھے اور کہاں جانکلے کس غرض سے تلوار پکڑی تھی اور کہاں استعمال ہونے لگی؟

مولانا کی اس ڈپلومیسی کو دیکھ کر خود بخود ذہن اُن ممالک کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جو اپنے دفاع کی غرض سے ہتھیار لے کر جارحانہ مہمات میں استعمال کرنے لگتے ہیں۔ مولانا کو اختیار ہے کہ جو چاہیں کریں اور جس طرح چاہیں سوچیں صرف اتنی احتیاط لازم تھی کہ حاسد دشمن کے لئے جو پہلے دن سے ہی اسلام

[1] "الجہاد فی الاسلام"، صـ ۱۳۸

اور داعیٔ اسلام پر بشدت حملہ آور ہے اور موقع کی تلاش میں ہر آن چوکس و ہشیار ہے خود اپنے ہاتھ سے قلعے کے دروازے نہ کھول دیتے!

اگر مولانا نے قرآن و حدیث کا مطالعہ نہ کیا ہوتا۔ یا اُنھیں تاریخ اسلام کی کچھ بھی واقفیت نہ ہوتی۔ تو مَیں اس خیال سے تسلی پا لیتا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں لاعلمی میں کہہ رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ یہ کہنے کی بھی گنجائش باقی نہیں۔ علم سب اپنی جگہ پر ہے۔ اور سب کچھ جان رہے ہیں لیکن باوجود اس کے کہ تاریخ اسلام کا ایک ایک ورق اور ایک ایک لفظ اس نظریہ کو ببانگِ دہل جھٹلا رہا ہے کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کو کوئی ذرہ بھر بھی دخل تھا۔ پھر بھی مودودی صاحب اس نظریہ پر مُصر ہیں اور ببانگِ دہل مُصر ہیں کہ اسلام تلوار ہی کے زور سے پھیلا تھا۔ پس میں ان سے پُوچھتا ہُوں کہ اگر دِلوں کے زنگ دھونے کے لئے تلوار کی آب کی ایسی ہی ضرورت تھی تو ابُوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ کے دِلوں کے زنگ کس تلوار نے دھوئے تھے۔ اور کس تلوار نے بلالِ حبشیؓ کے دِل میں توحید کا نُور داخل کیا تھا۔ پھر وُہ تلوار کون سی تھی جس نے زیدؓ بن حارث اور زبیرؓ بن العوام کو مسلمان کیا؟ اور وُہ کون سی تلوار تھی جو حمزہؓ اور طلحہؓ کے دِل کو ایمان بخش گئی؟ عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور ابُوعبیدہؓ بن عبداللہ، عثمانؓ بن مظعون اور سعدؓ بن ابی وقاص کے دل کس تلوار کی آب سے مصفّٰی کیے گئے؟ اور وُہ سارے مہاجرین اور وُہ سارے انصار جن کی تعداد ہزارہا تک جا پہنچتی ہے اور جن کے متعلق خود مولانا کو بھی تسلیم ہوگا کہ اُن کے قبولِ اسلام میں کسی تلوار کے دخل کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

کس طرح تطہیرِ قلوب کے اس ضروری ہتھیار کے بغیر پاک دل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ کس طرح اُن کے زنگ کھرچے گئے اور نیا رنگ چڑھانے کے لئے دل صیقل کیے گئے؟ مولانا! تاریخ اسلام پر ایک نظر ڈال کر بتائیے کہ کیا یہ درست نہیں کہ یہ مہاجرینؓ و انصارؓ جن کے قبولِ اسلام میں تلوار کے دخل کے آپ بھی منکر ہوں گے یہی تو وہ پھل تھا جو چمنِ اسلام کے بوٹے بوٹے کی زینت تھا۔ اسی چمن کی زینت جس کی آبیاری سیدِ ولدِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نیم شبی گریہ زاری سے کی۔ جسے اپنے آنسوؤں سے آپ نے سینچا اور جانکاہ مشقت سے پروان چڑھایا۔ ہاں یہ وہی کائنات کا خلاصہ تو تھے۔ جسے ایک زیبا فخر کے ساتھ اسلام کا رسولؐ دُنیا کے سامنے پیش کرتا رہا۔ وہ خلاصہ جس کے ظہور کی خاطر عدم کو وجود کی خلعت بخشی گئی۔ ہاں یقیناً یہی تھے وہ بُقعہ ہائے نور جنھیں نیّرِ اسلام نے آسمانِ ہدایت کے ستارے قرار دیا۔ اور جن کے متعلق سخت گریہ وزاری کے ساتھ بدر کے میدان میں یہ التجا کی کہ اَللّٰھُمَّ اِنْ اَھْلَکْتَ ھٰذِہٖ الْعِصَابَۃَ فَلَنْ تُعْبَدَ فِی الْاَرْضِ اَبَدًا۔" اے اللہ! اگر اس جماعت کو تُو نے ہلاک ہونے دیا تو زمین میں پھر کبھی تیری عبادت نہ کی جائے گی۔"

یہ وہی عُبّاد کی سرتاج جماعت تھی جس کے دل ربّ الرحیم کی تخت گاہ بن گئے اور سینے خُدا کے ذکر سے معمور ہو گئے۔ یہ کون لوگ تھے اور یہ سب کچھ کیسے ہُوا؟ کیا یہ وہی عرب کے بسنے والے آزاد منش نہ تھے۔ جن کے دل الا ماشاء اللہ قبولِ اسلام سے پہلے طرح طرح کی بدیوں کے پھندوں میں

گرفتار تھے۔ اور شرک کا زنگ اُن پر تہ بہ تہ چڑھا ہُوا تھا جنھیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رُوحانی پانی سے دھویا اور پاک وصاف کیا پھر اُن کے ظاہر و باطن کو خدا تعالیٰ کے رنگ میں خوب رنگین کر دیا۔ یہاں تک کہ یہ رنگ اُن کی رُوح کی پہنائیوں تک اُتر گیا اور ایسا وافر ہُوا کہ پیشانیوں سے پھوٹنے لگا ——— مگر ایک مرتبہ بھی اس عظیم رُوحانی انقلاب کے دوران میں داعئ اسلام کو آلاتِ جنگ کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کیا وُہ بعد کے آنے والے مُسلمان جو اسلام کے ایک عام رُوحانی غلبہ کے بعد مسلمان ہُوئے۔ اِن ستاروں کی خاکِ پا کے برابر بھی تھے؟ .... مولانا! آپ کہاں چلے گئے اور کن ویرانوں میں بھٹک گئے؟ سُنیئے کہ مَیں خُدا کی عظمت اور جلال کی قسم کھا کر کہتا ہُوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین اپنی اشاعت کے لئے کسی دُوسرے سہارے کا محتاج نہ تھا۔ آج بھی نہیں ہے اور آئندہ بھی کبھی نہ ہوگا۔

یہ آپ نے کیا کہا کہ تلوار کا کام "قلبہ رانی" ہے۔ اور یہ آپ نے کیا کہہ دیا کہ تلوار قبولِ ہدایت سے پہلے دلوں کے زنگ کو دُور کرتی ہے۔ کیا آپ فطرتِ انسانی کی الف بے سے بھی واقف نہیں؟ کیا آپ اِس کھلی ہوئی حقیقت سے بھی آشنا نہیں کہ تلوار بیج کے لئے قلبہ رانی نہیں کرتی۔ بلکہ خود نفرت اور بغاوت کے بیج بوتی ہے اور فطرتِ انسانی کے انگ انگ کو زہر آلود کر دیتی ہے۔ نہیں، نہیں اسلام ہرگز تلوار کے جلو میں دِلوں پر قبضہ نہیں کرتا بلکہ خود اپنی ذات میں ایک کامل رُوحانی طاقت ہے جو اپنے حق کے رُو سے

ہر سرکش سے سرکش سر کو خم کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ بتایئے کہ عمرؓ کا سرکش نے خم کیا تھا؟ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تلوار نے یا سُورۂ مریم کی چند آیات کی تلاوت نے؟

بعض تاریخی حقائق پر نظر

مولانا کو اپنے اس متشدّدانہ نظریہ کی تائید ہیں کہ اسلام تنہا نہیں بلکہ تلوار کے سہارے سے ہی پھیل سکتا ہے۔ تاریخ اسلام سے اگر کوئی دُور کی گواہی مل سکتی ہے تو وُہ صرف یہ ہے کہ جب اسلام کو فتحِ مکّہ کے بعد سیاسی غلبہ نصیب ہو گیا اور جنگِ حنین نے حملہ آور دُشمنوں کی رہی سہی طاقت بھی ختم کر دی تو اسلام بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔ یہ ہے وُہ تنہا تاریخی دلیل جس کے کھونٹے پر یہ سارا نظریہ ناچ رہا ہے۔ آیئے ہم کچھ دیر کے لئے اِس دلیل کو تسلیم کر کے دیکھیں کہ اِن بعد کے آنے والے مُسلمانوں کے دِلوں کو تلوار نے کس درجہ زنگ سے پاک کیا تھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ وُہی بعد کے آنے والے تھے جنھوں نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے وصال کے بعد سب سے پہلی خدمتِ اسلام یہ کی کہ اسلامی حکومت کے خلاف ایک عام علمِ بغاوت بلند کر دیا اور لشکر در لشکر مرکزِ اسلام کی طرف چڑھ دوڑے۔ مولانا! آیئے اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے کہ اگر یہی وُہ لوگ تھے جن کے سر تلوار نے خم کئے تھے۔ اور جن کے دِلوں کو زنگ سے خُوب صاف کر کے اسلام کا نُور قبُول کرنے کے لئے تیار کیا تھا تو یہ زنگ تو دوڑا چلا آتا ہے اور دلوں کو پھر ہر سمت سے اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اور دیکھئے کہ وُہ کون لوگ تھے

جنہوں نے اس مشکل وقت میں اسلام کے لئے دشمن کے تیروں کے سامنے اپنے سینے سپر کئے۔ کیا وہی ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ نہیں تھے جن کے دلوں سے جاہلیت کے زنگ کو کسی تلوار نے نہیں چھڑایا تھا؟ بلکہ وہ تو نورِ محمدیؐ کی پیہم برسنے والی بارش سے دھل کر آئینوں کی طرح چمک اٹھے تھے۔

مَیں نے مندرجہ بالا استدلال محض اس مفروضہ کو کچھ دیر تسلیم کرتے ہوئے پیش کیا ہے کہ یہی وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں اسلام محض اپنی صداقتوں کے زور سے نہیں بلکہ تلوار کی مدد سے داخل ہوا تھا۔ تلوار نے پہلے ہل چلایا پھر اسلام نے بیج بو دیا[1]۔ تب کہیں جا کر اسلام کی فصل پیدا ہوئی۔ پس میں مولانا کو اس فصل کا پھل دکھا رہا تھا۔ جو مبیّنہ طور پر تلوار کے ہل کی پیداوار تھی۔ اب مَیں قارئین کے سامنے وہ حقائق پیش کرتا ہوں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے قبولِ اسلام میں نہ پہلے نہ درمیان میں، نہ کبھی بعد میں تلوار کو دخل نصیب ہوا۔ سب سے پہلے مَیں اسی گروہ کے ذکر کو لیتا ہوں جو سب سے بعد میں مسلمان ہوئے۔ اور جن سے متعلق یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے براہِ راست تلوار کے خوف سے یا بالواسطہ اُس کے اثر سے اسلام قبول کیا۔ لیکن تاریخی حقائق پیش کرنے سے پہلے اس ضمن میں چند ایک تعارفی کلمات گوش گذار کرنے ضروری سمجھتا ہوں۔

تاریخِ اسلام کے غیر متعصب آزاد مطالعہ کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچے

[1] مولانا مودودی اس طریق اشاعتِ اسلام کو اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" کے صفحہ ۱۳۸-۱۳۹ پر پیش فرماتے ہیں۔

بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلام کے پھیلانے میں تلوار کبھی بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی مددگار نہیں ہوئی۔ بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ مسلمانوں کی دفاعی جنگیں جو سخت مجبُوری کے طور پر انسانی جان کی حفاظت کی غرض سے لڑی جا رہی تھیں اسلام کے بسُرعت پھیلنے کے راستہ میں درحقیقت روک بن رہی تھیں اور یہ روک کئی طریق پر پیدا ہوتی تھی مثلاً :-

(۱) ان لڑائیوں کو اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ اور شریر النفس لوگ فرضی مظالم مسلمانوں کی طرف منسُوب کر کے سخت اشتعال انگیز نظموں کے ذریعہ عرب میں آتشِ غیظ وغضب بھڑکا رہے تھے۔ چنانچہ کعب بن اشرف کے متعلق روایت آتی ہے کہ یہ بدبخت جنگ بدر کے بعد خاص طور پر اس غرض کے لئے مکہ پہنچا تھا کہ اپنی نظموں کے ذریعے قریش کی آتش انتقام کو بھڑکائے اسی طرح یہی کعب بن اشرف دوسرے قبائلِ عرب میں بھی مُسلمانوں کے خلاف زہریلا مواد پھیلاتا رہا۔ اس کے علاوہ قریش کی طرف سے بھی مسلسل مسلمانوں کو بدنام کرنے کی مذمُوم کوشش کی جاتی رہی اور اُنہیں نعوذ باللہ ایک خونی لٹیروں کے گروہ کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔

(۲) حملہ آوروں میں سے جو مقابل پر مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جاتے تھے اُن کے پسماندگان عرب دستور کے مطابق انتقام کی قسمیں کھاتے تھے۔ اور سارا کنبہ یا قبیلہ ان موتوں کا اسلام ہی کو ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ اور ناحق یہ دین مظلوم اُن کی نفرت کا نشانہ بن جاتا تھا۔

(۳) ان مخالفانہ حالات میں عرب کی اکثر آبادی تک اسلام کا پیغام

پہنچانا اور دلوں سے غلط فہمیوں کو دور کرنا ایک امر محال بن گیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں تبلیغ لازماً ایک بہت ہی محدود دائرے تک مقید ہو کر رہ گئی تھی۔

(۴) جن لوگوں تک اسلام کا پیغام پہنچ سکا تھا۔ اور وہ اُس کی سچائی کے قائل بھی ہو چکے تھے اُن میں سے بھی ایک کمزور دل طبقہ محض اس مخالفانہ ماحول سے ڈر کر اس کے اظہار سے رُکا ہوا تھا۔ اور اِن لڑائیوں کی ایک دہشت دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔

(۵) انفرادی طور پر دشمنی کا ڈر نہ ہونے کی صورت میں بھی اسلام میں شمولیت ایک خاص جرأت اور مردانگی چاہتی تھی۔ کیونکہ اس شمولیت کا مطلب مسلمانوں کی دفاعی جنگوں میں اُن کے ساتھ شریک ہونے کے مترادف تھا اور مسلمانوں کی کمزوری کے پیش نظر دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب تھا کہ کوئی جان بوجھ کر آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی موت کے منہ میں قدم رکھ دے۔

(۶) خود حفاظتی کے اقدامات کے سلسلہ میں مسلمانوں کا اتنا وقت صرف ہو جاتا تھا کہ انھیں تبلیغی مشاغل کے لئے بہت کم فرصت ملتی تھی۔

اگر مندرجہ بالا دعویٰ درست ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ جب تک مسلمان مصروف پیکار رہیں اشاعتِ اسلام کی رفتار دھیمی پڑی رہے مگر جوں ہی جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے یہ رفتار تیز تر ہو جائے۔ اور مذکورہ روکوں کے ہٹ جانے کی وجہ سے اسلام کا سیلاب موجیں مارتا ہوا صحرائے عرب کے گوشے گوشے کو سیراب کرتا رہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بعینہٖ اسی طرح ہوا اور صلح کے دور میں اشاعتِ اسلام کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز

ہو جاتی رہی۔ اگر کوئی شخص شبہ پر تُلی ہی بیٹھے تو فتحِ مکہ کا دن وہ پہلا دن ہے جس کے بعد یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ شاید تلوار کے ذریعہ حاصل شدہ غلبہ کے نتیجہ میں اسلام قبول کرنے کی طرف لوگوں کو میلان ہوا ہو۔ مگر صلحِ حدیبیہ کے دور پر تو یہ شبہ کسی طرح نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ صلح خود بظاہر نظر میں ایک کمزوری کی دلیل تھی اور دشمن اسے اپنی فتح کا نام دیتا تھا۔ اب دیکھئے کہ دعویٰ نبوت سے لیکر صلحِ حدیبیہ تک جو مصیبتوں اور بدامنی کا دور تھا تقریباً اُنیس سال کے عرصہ میں جس قدر لوگوں نے اسلام قبول کیا اس سے کہیں زیادہ تعداد میں صلح کے دو سالہ دور میں لوگ مسلمان ہوئے۔ یہ موازنہ حیرت انگیز ہے۔ مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ زیادہ سے زیادہ مسلمان مردوں کی تعداد جو صلحِ حدیبیہ سے پہلے کسی جنگ میں شریک ہوئی ہے۔ وہ تقریباً تین ہزار افراد بنتی ہے۔ یہ بڑے سے بڑے تخمینہ کے مطابق اسلامی فوج کے ان سپاہیوں کی تعداد ہے جنھوں نے جنگِ احزاب میں حصہ لیا۔ اسکے مقابل فتحِ مکہ کے موقع پر مسلمان لشکر کی تعداد دس ہزار قدوسیوں پر مشتمل تھی۔ ان مزید سات ہزار میں سے بہت ہی کم تھے جو جنگِ احزاب اور صلحِ حدیبیہ کے درمیان مسلمان ہوئے۔ اکثریت بھاری اکثریت نے صلحِ حدیبیہ کے دو سالہ امن کے دور میں ہی اسلام قبول کیا۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص اور حضرت خالدؓ بن ولید سیف اللہ بھی اسی دور کے مسلمانوں میں سے ہیں۔

یہ موازنہ صاف طور پر ثابت کرتا ہے کہ خود دفاعی جنگیں ہی اشاعتِ اسلام کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ثابت ہو رہی تھیں۔ کجا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نعوذ باللہ اس غرض سے مودودی اصطلاح میں مصلحانہ جنگوں کا آغاز کرتے

اس کے علاوہ اس موازنہ سے یہ امر بھی صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جب فتح مکّہ اور پھر جنگِ حُنین کے بعد اُن کا دور آیا تو اہلِ عرب کا جوق در جوق مسلمان ہونا کسی غلبہ کے اثر سے نہ تھا بلکہ صلح حدیبیہ کے دور کی طرح مُسلمانوں کی پُر امن تبلیغ کے نتیجہ میں تھا۔

اب رہا یہ سوال کہ ان بعد کے مُسلمانوں نے حضرت اُبوبکرؓ کی حکُومت کے خلاف کیوں بغاوت کی؟ تو اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ دراصل اس دور کے اکثر مُسلمانوں کو جو بدوی قبائل سے تعلّق رکھتے تھے براہِ راست آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے تربیت پانے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ بلکہ اکثر قیمت اُن میں سے ایسے تھے جنھوں نے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے نورانی چہرہ کو ایک نظر دیکھا بھی نہ تھا۔

اس زمانے میں سفر ایسے پُرمشقّت ہُوا کرتے تھے کہ یہ ممکن نہیں تھا کہ دُور دور کے قبائل کے تمام افراد فرداً فرداً آں حضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اس لئے عرب کے طریق کے مطابق مختلف قبائل یا تو کوئی تبلیغی وفد اپنے ہاں بُلوا لیتے تھے یا اپنے وفود آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں بھجوا دیا کرتے تھے۔ جو کافی بحث و مباحثہ کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتے تھے اور پھر وفد کا جو بھی فیصلہ ہوتا تھا قوم اُس کے پیچھے چلتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو آں حضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے تربیت تو در کنار صحابۂ کبار سے بھی تربیت حاصل نہ کر سکے تھے اس پر مزید ابتلا یہ آن پڑا کہ وہ سب ہادیوں کا راہ نما اور ہدایتوں کا سُورج

ان بدقسمتوں کے قبولِ اسلام کے تھوڑی ہی دیر بعد غروب ہو گیا۔ اور ایک نسبتی اعتبار سے اُفقِ عرب پر اندھیرا چھا گیا۔ تاریخ کے اِن اوراق میں ہمارے لئے ایک گہرا سبق ہے کہ جب قومیں اپنے وقت کے نبی کا انکار کرتی ہیں اور بزور اُس نور کو بجھانے کی کوشش کرتی ہیں تو اس دُنیا میں ایک سخت دردناک سزا اُن کو یہ ملتی ہے کہ اُن کی اکثریت کو اُس وقت ایمان نصیب ہوتا ہے جب وُہ نبی اُن سے جدا ہونے کو ہوتا ہے یا پھر اس سے بھی دیر میں اُس نبی کی جُدائی کے بہت بعد۔ پس کیا ہی بدنصیب ہیں وُہ عُشاق جو وصل کے دور میں تو ایک قابلِ صد محبت وجود سے نفرت کر رہے ہوں۔ مگر جب فراق کی گھڑی آپہنچے یا ہجر کی راتیں مسلط ہو جائیں تو اُن کے قلوب میں شعلہ عشق بھڑک اُٹھے۔

آیئے! اب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دعویٰ نبوت سے لے کر آپ کے وصال تک کی تاریخِ اسلام پر ایک متجسّسانہ نظر ڈال کر دیکھیں کہ کسی دور میں شاید کسی اور طریق سے جبری طور پر مسلمان بنانے کا کوئی ثبوت ملتا ہو۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ فتوحات کے معًا بعد خوفزدہ مخالفین کو بزور قبول کرنے کی تلقین کی گئی ہو یا اُن کی جاں بخشی یا آزادی کے لئے مسلمان ہونے کی بطور شرط کے رکھ دیا گیا ہو۔

حضرت رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو فتح مکہ تک تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔ اوّل وُہ انتہائی مظلومی کا دور جو دعویٰ نبوت سے لے کر ہجرت تک ممتد ہے۔ اور جسے عُرفِ عام میں مکی دور کہا جاتا ہے۔ دوسرا وُہ مدنی دور جو واقعہ ہجرت سے لیکر صلح حدیبیہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دور بھی

دراصل ایک سخت مظلومی ہی کا دور ہے۔ کیونکہ اگرچہ مسلمانوں کو دفاع کی اجازت دے دی گئی تھی مگر وہ اپنے دشمن کے مقابل پر کیا بلحاظ تعداد اور کیا بلحاظ جنگی ساز و سامان کوئی بھی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ سارے عرب کے سینہ میں صرف مدینہ ہی ایک ایسی بستی تھی جہاں مسلمان جمعیت آباد تھی۔ اور اس ایک بستی پر بھی اُن کا مکمل قبضہ نہ تھا۔ بلکہ یہود کے تین متمول قبائل اس کے ایک بڑے حصہ پر قابض تھے۔ اور اوس و خزرج کے تمام افراد بھی حلقہ بگوش اسلام نہ ہوئے تھے۔ اُن کی مثال ایسی ہی تھی جیسے ایک مضبوط پہلوان کے مقابل پر ایک کمزور بچے کو اپنے دفاع کی اجازت دے دی جائے۔ وہ پہلوان تو زرہ بکتر میں ملبوس ہو، اُس کے ہاتھ میں نیزہ ہو اور تلوار زیب کمر ہو۔ اور ایک قد آور جنگی گھوڑے پر سوار ہو۔ مگر وہ بچہ ننگے پاؤں، نیم عریاں ایک ٹوٹی ہوئی تلوار لے کر اُس کے مقابل پر نکلے۔ سارے عرب کی قوت تو مدینہ میں بسنے والے اُن چند مسلمانوں کے مقابل پر بہت ہی زیادہ تھی۔ صرف جنگِ بدر ہی میں حملہ آور دشمنوں اور مسلمانوں کی دفاعی فوج کا موازنہ کیا جائے تو وہ کچھ اسی قسم کا موازنہ ہوگا۔ پس ہر چند کہ دفاع کی اجازت مل چکی تھی مگر اس دور کو بھی میں سخت مظلومی کا دور ہی کہوں گا۔

تیسرا دور وہ دور ہے جو صلح حدیبیہ سے لیکر فتح مکہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ صلح اور امن کا دور تھا۔ جس میں کفار مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر کوئی حملہ نہیں کیا گیا۔ تاہم یہود اور بعض دیگر قبائل کی عہد شکنیوں کے نتیجہ میں بعض غزوات و سرایا وقوع پذیر ہوئے۔

مکی دَور

دورِ اوّل کے متعلّق جو تیرہ سال کی انتہائی مظلومی کا عرصہ ہے اسلام کے اشد ترین معاندین بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے۔ کہ اِس دور میں اسلام کی طرف سے کسی بھی غرض کے لئے تلوار اُٹھائی گئی ہو۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ مخالف تلواروں کے خوف کے باوجود کشاں کشاں بہت سے فدائی اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ پس مکّہ میں ہونے والے تمام مسلمان جو بعد میں مہاجرین کہلائے اِس الزام سے قطعاً بری ہیں کہ اُن کے قبولِ اسلام میں تلوار کو کوئی دخل تھا۔

ہجرت تا صلح حُدیبیہ

دُوسرے دور کے متعلق اس خیال سے کہ اس دور میں مُسلمانوں نے اپنے دفاع کے لئے تلوار اُٹھائی۔ شاید بعض بدظن طبیعتیں یہ کہہ سکیں کہ ہو سکتا ہے اس دفاعی تلوار کے خوف سے اسلام پھیلا ہو۔ مگر اس دور کے اسلام قبول کرنے والوں پر اگر ایک اُچٹتی ہوئی سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو یہ واہمہ اسطرح معدوم ہوجاتا ہے جیسے آفتاب کے طلوع ہونے پر رات کی تاریکی۔

اِس دور کے وُہ مسلمان جو مدینہ کے باشندے تھے انصار کہلاتے تھے۔ اور یہ تقریباً سارے کے سارے اوس اور خزرج قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ چند افراد نے یہود میں سے اسلام قبول کیا تھا۔ اور کچھ وُہ مسلمان تھے جو مدینہ کے علاوہ دوسری بستیوں کے رہنے والے تھے۔ مکّہ میں بھی اسلام کی ترویج کلیتہً بند نہ ہوسکی تھی۔ اور کفّارِ مکّہ کی شدید ایذا رسانی کے باوجود وہاں اِکّا دُکّا قبولِ اسلام کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

اِس مدنی دور کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت **انصار** پر مشتمل تھی۔ اور انصار کا بلا جبر و اکراہ اسلام قبول کرنا بھی ایک ایسی واضح اور نکھری ہوئی حقیقت ہے کہ دوست تو دوست دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ **انصار کو مہاجرین** کی تلوار نے مسلمان بنایا تھا۔ یا اُن کے قبولِ اسلام میں تلوار کو ذرّہ بھر بھی کوئی دخل تھا۔ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اوس و خزرج کے ساتھ سرے سے کوئی جنگ ہی نہیں لڑی۔ پس بزورِ شمشیر مسلمان بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہود میں سے مسلمان ہونے والوں کی تعداد بُہت تھوڑی تھی اور ان میں سے بھی کسی پر اس شک کی گنجائش موجود نہیں کہ وُہ تلوار کے خوف سے مُسلمان ہوا۔ بلکہ ان کا مسلمان ہونا ایسے شدید مخالف اور خطرناک حالات میں ہوا جب کہ خود مسلمانوں کا مستقبل بھی بظاہر سخت مخدوش تھا۔ بیرونی قبائل کے نومسلمین بھی جن کی تعداد **انصار** کی نسبت بُہت ہی تھوڑی تھی قطعاً کسی تلوار کے خوف سے مُسلمان نہیں ہوئے۔ اُنھوں نے سخت خطرناک حالات میں اسلام قبُول کیا۔

اب رہیں اس دور کی جنگیں اور مہمات تو اُن کے نتیجہ میں تلوار کے ڈر سے مسلمان ہونے والوں کی زیادہ سے زیادہ امکانی تعداد جنگی قیدیوں کی تعداد ہی ہوسکتی ہے۔ اِس امر کی چھان بین کے لئے ضروری ہے کہ ہم ہجرت سے لیکر صلح حدیبیہ تک کے تمام غزوات و سرایا پر نظر ڈالیں۔ ان غزوات و سرایا کی کُل تعداد پچاس ۵۰ ہے۔

غزوہ یا سَرِیّہ سے بعض لوگ غلطی سے جنگ مُراد لے لیتے

ہیں۔ لیکن یہ خیال لاعلمی کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ غزوہ سے مُراد محض ایسی مہم ہے جس میں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔ خواہ لڑائی ہو، چور ڈاکو کا تعاقب ہو یا دیکھ بھال کے لئے کوئی پارٹی باہر جائے وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح **سَرِیَّہ** سے مُراد بھی مہمات ہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سَرِیَہ میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم شامل نہیں ہوتے۔ مذکورہ بالا کے علاوہ تبلیغی سفر بھی غزوہ اور سریہ میں شمار ہوتے ہیں اور کسی صحابی کی انفرادی مہم بھی سریہ ہی کہلاتی ہے۔ چنانچہ اس دور میں کُل پچاس غزوات وسرایا ہوئے۔ جن میں سے جنگ کہلانے کے مستحق صرف تین ہیں :-

جنگِ بدر۔ جنگ احد اور جنگِ احزاب۔

ان پچاس میں سے ۴۲ میں کوئی اسیر نہیں ہوا۔ جن آٹھ میں اسیر ہوئے اُن میں سے قابلِ ذکر تعداد جنگِ بدر کے اسیروں کی ہے۔ کُل ۷۲ اسیر تھے جن میں سے دو پرانے جرموں کی پاداش میں قتل کئے گئے۔ اور باقی سب کو **فِدیہ** لے کر آزاد کر دیا گیا۔ ان میں سے بعض کا فدیہ یہ تھا کہ انصار کے بچوں کو لکھنا سکھادیں۔ جنگِ اُحد میں کوئی دشمن قید نہیں ہوا نہ ہی جنگِ احزاب میں کوئی قید ہوا۔ غزوۂ بنی مصطلق میں سَو سے اوپر زن و مرد اسیر ہوئے۔ مگر سب کو بلامعاوضہ و بلا شرط رہا کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ چند ایک سریوں میں ایک ایک دو دو قیدی ہاتھ آئے جو بلا معاوضہ و بلا شرط رہا کئے گئے۔ یہ سب حقائق وہ ہیں جو خود مولانا کو بھی تسلیم ہیں۔

مگر مَیں کہتا ہُوں کہ اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ سب جنگی

قیدی بزورِ شمشیر مسلمان بنالئے گئے تھے تو بھی اُن کی تعداد اتنی قلیل اور ناقابلِ ذکر ہے کہ اُس کی مہاجرینؓ اور انصارؓ کے سوادِ اعظم کے مقابل پر کوئی بھی حیثیت نہیں۔ اور اس کو بنیاد بناکر وہ نتیجہ بہرحال مترتب نہیں ہوتا جو مولانا مودودی نے مرتب فرمایا ہے۔ سوائے اس کے کہ تمسخر کے طور پر کسی کو ہنسانے کے لئے یہ بات کہی جائے یا شدید تعصب کی ایسی پٹی آنکھوں پر بندھی ہوئی ہو کہ معترض آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام تراشی کے لئے تنکوں کے سہارے کو بھی غنیمت جانتا ہو۔

تیسرا دور۔ صلح حدیبیہ تا فتح مکہ

اِس دور میں ہونیوالے غزوات و سرایا کی تعداد بائیس ہے۔ ان میں سے صرف تین ایسے تھے جن میں جنگی قیدی ہاتھ آئے ایک سریہ حسمی (جمادی الآخر ۶ ہجری) ہے۔ جس میں حضرت زیدؓ بن حارثہ نے ھنید ڈاکو اور اُس کے ساتھی لٹیروں پر چڑھائی کی اور سو لٹیروں کو اسیر بنایا مگر توبہ کا وعدہ لے کر چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ سریہ بنو کلاب اور سریہ بشیر بن سعد انصاری میں چند گنتی کے قیدی ہاتھ آئے۔ مگر اُن کے حالات نامعلوم ہیں۔

پس اِس امر میں کوئی بھی شک باقی نہیں رہ جاتا کہ ہجرت سے لیکر فتح مکہ تک ایک بھی قیدی کو بزورِ شمشیر مسلمان بنانے کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ تلوار نے تو صرف زنگ صاف کیا تھا۔ اس کے بعد اسلام کا رنگ اُن کے دلوں پر چڑھایا گیا۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ

انھیں پھر اُسی زنگ آلود شرک کی دُنیا میں واپس لوٹنے کی اجازت دے دی گئی۔
پھر کیا مولانا مودودی بتا سکتے ہیں کہ آخر وُہ کون لوگ تھے جن کو اپنی تمام اخلاقی
اور رُوحانی قوتوں کی ناکامی کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ
تلوار کی چمک دِکھلا کر مسلمان بنایا تھا۔ وُہ کب پیدا ہُوئے۔ کس جگہ کے رہنے والے
تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے ؟ کیا انھیں زمین نگل گئی یا آسمان
کھا گیا ؟ اور اگر اُن کا وجود محض مولانا کے تصوّر کی پیداوار ہے تو پھر کیوں سیدِ
وُلدِ آدم پر ایسی سنگین اور بے بنیاد الزام تراشی سے نہیں رُکتے۔ اگر آں حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم مذہب میں جبر کے قائل ہوتے تو کیوں نوکِ خنجر پر اُن بے بس
قیدیوں کو مسلمان نہ بنا لیا ؟

بنو قینقاع - بنو نضیر اور بنو قریظہ

مؤخر الذکر دونوں ادوار کے قیدیوں
کی تعداد میں یہود قبائل بنو قینقاع - بنو نضیر اور بنو قریظہ کے قیدیوں کا شمار
شامل نہیں جن کے ساتھ مختلف وقتوں میں مسلمانوں کو مقابلہ کرنا پڑا۔ ان کا مختصر
ذکر اب علیحدہ طور پر کیا جا رہا ہے۔

اس حصّہٴ مضمون کا تعلق محض اِس الزام سے ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہٴ اسلام اخلاقی قوتوں کی بجائے تلوار کے زور سے ہُوا
تھا۔ اور ہم اس وقت صرف اِس امر کی چھان بین کر رہے ہیں کہ اس تمام
جنگی دور میں کل کتنے ایسے قیدی ہاتھ آئے تھے جن کو بزور مُسلمان بنا لیا گیا تھا۔
یا جن کے قبولِ اسلام پر یہ شُبہ بھی پڑ سکتا ہے۔

اب تک جو ہم نے جستجو کی ہے اس سے تو معاملہ بالکل برعکس نظر آرہا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم قیدیوں کے گروہ دیکھیں جو مسلمانوں کی تلواروں کے نیچے کانپتے ہوئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ پڑھ رہے ہوں۔ ہم دیکھتے یہ ہیں کہ تلواروں کی وجہ سے نہیں بلکہ تلواروں کے خوف کے باوجود اہلِ عرب مسلسل مسلمان ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اور ہم دیکھتے یہ ہیں کہ باوجود اس کے کہ مظلوم مسلمان عملاً مدینہ کی ایک چھوٹی سی بستی میں قید ہیں جو اندر سے بھی محفوظ نہیں۔ کیونکہ اندر بیٹھے ہوئے جب موقع پاتے ہیں شرارت کرتے ہیں اور باہر سے بھی محفوظ نہیں۔ کیونکہ سارا عرب اُن کی جان کا دشمن ہو رہا ہے۔ مگر پھر بھی کچھ سرفروش ایسے ہیں جو مسلمان ہو ہو کر اس جماعت میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر مخالفت کو ایک آگ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے تو مدینہ میں مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ میں ایک نقطہ کی طرح تھے جسے جلانے کے لئے وُہ آگ چاروں طرف سرزمینِ عرب میں بھڑک رہی تھی۔ یہ مَیں اُس دور کا ذکر کر رہا ہوں جسے دُشمنانِ اسلام آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی طاقت اور شمشیر کا دور کہتے ہیں۔ پس اس دور میں جو لوگ مسلمان ہو کر مدینہ آبیٹھتے تھے وُہ تو جلانے والوں کو چھوڑ کر جلنے والوں میں شامل ہونے آیا کرتے تھے۔ اکثریت کو چھوڑ کر اقلیت کی طرف بھاگتے تھے۔ اور جو لوگ مدینہ کی طرف ہجرت نہیں کر سکتے تھے اور مخالف ماحول ہی میں رہنے پر مجبور تھے۔ ان کی مثال بھی کچھ اس قسم کی تھی جیسے وحشی بھیڑیوں کے ایک غول میں کوئی بھیڑیا برضا و رغبت اچانک بھیڑ بن جائے۔

اس بیچارے کے متعلق یہ کہنا کہ ایک چھوٹے سے بھیڑوں کے گلہ نے جو ایک بھیڑیوں سے بھرے ہوئے جنگل میں گھرا ہوا تھا اُسے ڈرا دھمکا کر اور مجبور کر کے بھیڑ بنایا ہے۔ اس سے زیادہ مسخر آمیز دعویٰ اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہود قبائل اور ان کے "قیدیوں" کا ذکر میں اس لئے الگ کر رہا ہوں کہ اس اندرونی خطرہ کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کراؤں جو ہر وقت مدینہ کے اندر سے انہیں لاحق تھا۔ یہ تینوں قبائل ایسے بدعہد، کمینہ فطرت اور دغا باز تھے کہ امن میں بھی مسلمانوں کو چین نہیں لینے دیتے تھے اور جنگ کے زمانے میں تو ان کی شرارتیں غیر مشکوک غداری میں بدل جاتی تھیں چنانچہ مسلمانوں سے دوستی کے معاہدہ کے باوجود اس وقت جب کہ مٹھی بھر مسلمان جنگِ بدر میں حملہ آوروں سے برسرِ پیکار تھے قبیلہ بنو قینقاع نے مدینہ میں بلوہ کیا اور فساد برپا کیا اور سراسر جھوٹی اور سراسیمہ کرنے والی خبریں پھیلائیں کہ آج بھی اس جرم کی سزا ہر رحم دل سے رحم دل حکومت کے نزدیک قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً اس معاہدہ کے پیشِ نظر جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی دور کے پہلے سال ہی میں یہود سمیت مدینہ کی تمام اقوام سے کیا تھا۔ یہ تمام غدار قتل کئے جانے کے سزاوار تھے۔ "سیرت ابنِ ہشام" جلد اوّل (مطبوعہ مطبع بولاق مصریہ) کے صفحہ ۱۷۸ پر یہ معاہدہ درج ہے۔ اس معاہدہ کی شرائط میں سے تین یہ تھیں :۔

۱ - جنگ کے دنوں میں یہودی مسلمانوں کے ساتھ مصارف میں شریک رہیں گے۔

۲۔ کوئی شخص اپنے معاہدے کے مقابل پر مخالفانہ کاروائی نہیں کرے گا۔
۳۔ مدینہ کے اندر کشت وخون کرنا اس معاہدہ کرنے والی سب قوموں پر حرام ہوگا۔"

مگر آں حضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ازراہِ شفقت محض جلا وطنی کی سزا پر اکتفا فرمائی۔ میرا ایمان ہے کہ اگر آئندہ مخدوش حالات کے پیشِ نظر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ بعد کے حملہ آوروں کے ساتھ مل کر یہ بدعہد یہود مسلمانوں کو اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچائیں گے تو آں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اُن کو یہ سزا بھی نہ دیتے اور بالکل معاف فرما دیتے۔ بہرحال اصل سوال زیرِ بحث یہ ہے کہ اس قبیلے کو باوجود غلبہ کے بزورِ شمشیر مسلمان نہیں بنایا گیا۔

دُوسرا یہود قبیلہ جسے ارتکاب بغاوت پر اور اس جُرم کی پاداش میں کہ اُنھوں نے آں حضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی جلاوطن کیا گیا قبیلہ "بنونضیر" تھا۔ چونکہ مُسلمانوں کے خلاف شرارتوں میں اور عہد شکنی میں سارا قبیلہ شامل تھا۔ اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ہلاک کرنے کی کوشش ایک منظّم سازش کا نتیجہ تھی۔ اس لئے دراصل یہ کینہ توز بھی معاہدہ اور عام انسانی قانون کی رُو سے اپنی زندگی کے حق سے محروم ہو چکے تھے۔ لیکن اُن کے ساتھ بھی اس لحاظ سے غیر معمولی نرمی کا سلوک کیا گیا اور صرف شہر بدر کرنے پر اکتفا کی گئی۔ اور بہرحال یہ امر یقینی طور پر ثابت ہے وُہ تلوار کے زور سے مسلمان نہیں بنائے گئے۔

تیسرا بد قسمت یہودی قبیلہ "بنو قریظہ" ہے۔ اس قبیلہ کی غداری باقی تمام قبیلوں سے زیادہ سنگین تھی۔ کیونکہ اُس وقت جب کہ جنگ احزاب کے موقعہ پر دل ہلا دینے والے خطرات نے مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور مدینہ میں محصور قلیل التعداد مسلمانوں اور کفار کے عظیم حملہ آور لشکر کے درمیان صرف ایک تنگ خندق حائل تھی اُنہوں نے انتہائی کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خطرناک بدعہدی کی اور دشمن کے ساتھ خفیہ سازشیں کرنے لگے۔

اگر کوئی شخص آج اس خطرہ کا کچھ تصور باندھنا چاہے تو اُس کا صرف ایک ہی طریق ہے کہ قرآن کریم کی اُن آیات کا مطالعہ کرے جن میں خود خدا تعالیٰ اپنے الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچتا ہے :-

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ (سورۃ الاحزاب ع ۲)

"جب وُہ (دشمن) تمہارے اوپر سے بھی (حملہ کرتے ہوئے) آئے اور نیچے سے بھی (یعنی بلندی کی طرف سے بھی اور ڈھلوان کی طرف سے بھی۔ یا معنوی لحاظ سے جب تمہاری نجات کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ زمین بھی تنگ ہو گئی اور آسمان بھی) اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے۔ اور تم خدا

کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے ۔ یہ تھا وُہ مقام اور وہ وقت
جب کہ مومن آزمائے گئے اور شدید زلازل کے جھٹکوں میں اُنھیں
مُبتلا کیا گیا ۔"

یعنی جس طرح خوفناک زلزلوں کے جھٹکوں کے وقت عمارتوں کی مضبوطی آزمائی جاتی ہے ۔ اور اُن عمارتوں کے سوا جن کی دیواروں میں پگھلا ہوا سیسہ پلایا گیا ہو یا فولادی بندھنوں سے مضبُوط کی گئی ہوں اور وُہ گہری بنیادوں پر مضبُوط چٹانوں کی طرح قائم ہوں باقی تمام عمارتیں اُن جھٹکوں کا شکار ہو کر پیوندِ خاک ہو جاتی ہیں ۔ اسی طرح مومنین کی اس عمارت کے لئے ایک دل ہلا دینے والی آزمائش کا دِن تھا ۔ یہ وُہ وقت تھا کہ خُدا تعالیٰ اہلِ مدینہ کو مخاطب کرتے ہُوئے فرماتا ہے :۔

"تم (اس شدید خطرہ کو دیکھ کر) اللہ تعالیٰ پر طرح طرح کے گمان کرنے
لگ گئے تھے ۔"

پس ایک طرف تو قرآنی بیان کے مطابق بیرونی خطرہ ایسا شدید تھا ۔ دُوسری طرف اندرُونی خطرہ کی یہ حالت تھی کہ مُنافق کُھلم کُھلا مومنوں کے حوصلے پست کرنے میں مصروف تھے ۔ اِسی اندرُونی خطرے کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اگلی آیت میں فرماتا ہے :۔

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَإِذْ قَالَتْ
طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ

تارجعوا .... (سورۃ الاحزاب)

"اور جب منافق اور دلوں کے مریض یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور اس کے رسول نے ہم سے دھوکہ کے سوا اور کوئی وعدہ نہیں کیا۔ اور جب اُن میں سے ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ یثرب کے رہنے والو! (بچاؤ) کا تو کیا سوال) تمہارے لئے ٹھہرنے تک کی کوئی جگہ نہیں اس لئے (اپنے پہلے دین میں) پھر جاؤ"

پس ان ہولناک ابتلاؤں کے وقت جب کہ مسلمانوں کو خطرات نے اُوپر سے بھی آلیا تھا اور نیچے سے بھی۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ بنو قریظہ جن کو معاہدہ کی رُو سے مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیئے تھا۔ اُن کی کمینگی اور غداری کا یہ حال تھا کہ حملہ آوروں کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف عہد و پیمان کرنے لگے۔ چنانچہ اس غداری کے نتیجہ میں جنگِ احزاب کے بعد جب مسلمانوں نے اُن پر غلبہ پالیا اور سزا کی تعیین کا وقت آیا تو ان بدبختوں نے اپنی قسمت کا فیصلہ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ کے ہاتھ میں چھوڑنے کی بجائے حضرت سعدؓ بن معاذ کے ہاتھ میں دے دیا۔ جن کے حکم سے سارے مرد تہِ تیغ کئے گئے۔ یہاں سوال زیرِ بحث یہ ہے کہ ان کو بھی بزورِ شمشیر مسلمان نہیں بنایا گیا۔ پھر کیا میں مولانا سے یہ پوچھنے میں حق بجانب نہیں ہوں کہ آخر وہ کون لوگ تھے جو اسلام کی تلوار کے اثر سے مسلمان ہوئے؟

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ تاریخ کے سبق کے دوران میں یونیورسٹی آف لندن کے تاریخ کے ایک متعصب پروفیسر نے اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ظلم کا الزام لگایا۔ مَیں اور میرے ایک عزیز دوست میر محمود احمد صاحب ناصر اسے برداشت نہ کر سکے اور جواب دینے کے لیئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر اُس پروفیسر نے کہا کہ یہاں بحث کا وقت نہیں تم کو جو کچھ کہنا ہو میرے کمرے میں آکر کہنا۔ مگر ہم نے اُسے یہ جواب دیا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے آقاؐ پر حملہ تو تم برسرِ عام کرو۔ اور جواب ہم علیحدگی میں دیں۔ چنانچہ جب ہم نے اس بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی تو ایک یہودی طالب علم اُٹھ کھڑا ہؤا اور اُس نے یہ اعلان کیا۔ کہ "اگرچہ مَیں یہودی ہُوں اور سب سے زیادہ مجھے اس بات کا غصّہ ہونا چاہیئے تھا۔ مگر یہ بحث سُننے کے بعد مَیں اِس بات کی گواہی دیتا ہُوں کہ محمّد (صلّے اللہ علیہ وسلّم) پر اس واقعہ سے ہرگز کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ اوّل تو یہ فیصلہ اُن کا نہیں تھا۔ دُوسرے سعدؓ بن معاذ کا فیصلہ بھی میرے نزدیک درست تھا۔ اور وُہ غدّار اِسی لائق تھے کہ تہ تیغ کیئے جاتے"۔

آج تک اُس شریف النفس یہودی کے الفاظ کا میرے دِل پر گہرا اثر ہے۔ اور مَیں تادمِ مرگ اُس کا ممنونِ احسان رہُوں گا اور ہمیشہ دِل سے اُس کے لیئے دُعا نکلتی رہے گی کہ اُس نے انصاف کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور غیر معمولی شرافت اور جُرات کا اظہار کرتے ہوئے میرے محبُوب آقاؐ کی بریّت کی۔ مگر جب میری نظر اُن لوگوں کی طرف لوٹتی ہے جن کے نزدیک بانیٔ اسلام کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دُوسرے میں قرآن تھا تو سینہ میں دِل خون ہونے لگتا ہے۔

فتحِ مکّہ

صلح حدیبیہ تک کا دور ختم ہوا اور فتح مکّہ کا دن آ گیا۔ جو در اصل حضرت رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذات پر سے ہر تشدّد کے الزام کو دُور کرنے کا دن تھا۔ اُس دن آں حضورؐ نے کفّارِ مکّہ پر ایک عظیم فتح حاصل کی۔ مگر کسی فردِ واحد کو بھی تلوار کے زور سے مُسلمان نہ بنایا۔ پس میں اُسی دن کا واسطہ دے کر یہ الزام لگانے والوں سے پُوچھتا ہُوں کہ جب وُہ نبیوں کا سردارؐ دس ہزار قدوسیوںؓ کے ساتھ فاران کی چوٹیوں سے جلوہ گر ہؤا۔ اور مکّے کو اُس کی شوکت اور جلال نے ڈھانپ لیا تو وُہ جبر کی تلوار کیوں زیرِ نیام چلی گئی۔ کیوں فتحِ مکّہ کے دن جب مشرکینِ مکّہ کی گردنیں اُس رسولؐ کے ہاتھ میں دی گئیں۔ جب تلواروں کے سائے تلے سرکشوں کے سر خم کرنے کا وقت آیا اور نوکِ خنجر سے ایمان قلوب میں اُتارنے کی مُبارک گھڑی آ پہنچی۔ وُہ ساعت جب کہ مُسلمان فاتحین کے خوف سے عرب سرداروں کے جسم لرزاں تھے اور سینوں میں دِل دھڑک رہے تھے۔ جب مکّہ کی بستی ایک دھڑکتا ہؤا دِل بن گئی تھی تو کیوں اُس فاتحینؓ کے سردارؐ نے شمشیر کی قوّت سے اُن کو مسلمان نہیں بنا لیا؟ اگر ایسا نہیں کیا اور یقیناً نہیں کیا تو پھر حیرت ہے کہ کس دل کے ساتھ یہ لوگ اُس سب محبُوبوں کے محبوبؐ اور اُس بے مثال دِلوں کے فتح کرنے والےؐ کے متعلّق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُس کی ہر قُوّتِ جاذبہ کی ناکامی کے بعد تلوار کی قوّت کارگر ثابت ہوئی۔ مولانا کے دِل کا حال مَیں نہیں جانتا کہ یہ لکھتے ہوئے اُس پر کیا گزری تھی یا کیا گُزر سکتی تھی۔ مگر اے کاش! کہ اُن کا قلم پھٹ جاتا اور سیاہی خون ہو جاتی۔

فتح مکّہ کا دن تو وہ دن ہے کہ جو ابدالآباد تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات سے جبر و تشدد کے الزام کی نفی کرتا رہے گا۔ اس دن کی گواہی ایک ایسی پُرشوکت اور بلند بانگ گواہی ہے کہ کتنی ہی صدیاں گزر گئیں۔ مگر آج بھی مؤرخین کے کان اُن کو سُنتے اور اُن کے دل اس پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ گواہی تو عیسائیوں نے بھی سُنی اور اہلِ ہنود نے بھی اسے قبول کیا۔ پھر حیرت ہے کہ مولانا کے کان اس بے مثال دن کی آواز سُننے سے کیوں محروم رہ گئے۔ اسی دن کی گواہی کا ذکر کرتے ہوئے ایک عیسائی مستشرق مسٹر سٹینلے لین پول لکھتے ہیں:۔

"اب وقت تھا کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) خونخوارانہ فطرت کا اظہار کرتے۔ آپ کے قدیم ایذا دہندے آپ کے قدموں میں آپڑے ہیں۔ کیا آپ اس وقت اپنے بے رحمانہ طریقہ سے ان کو پامال کریں گے؟ سخت عقوبت میں گرفتار کریں گے یا ان سے انتقام لیں گے؟

یہ وقت اُس شخص کے اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہونے کا ہے۔ اس وقت ہم ایسے مظالم کے پیش آنے کے متوقع ہیں جن کے سننے سے رونگٹے کھڑے ہوں۔ اور جن کا خیال کرکے اگر ہم پہلے ہی سے نفرین و ملامت کا شور مچائیں تو بجا ہے۔

مگر یہ کیا معاملہ ہے؟ —— کیا بازاروں

میں کوئی خونریزی نہیں ہوئی؟ ——— ہزاروں مقتولوں کی لاشیں کہاں ہیں؟ ——— واقعات سخت اور بے درد ہوتے ہیں (کسی کی رعایت نہیں کرتے) اور یہ ایک واقعی بات ہے کہ جس دن آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم۔ ناقل) کو اپنے دشمنوں پر فتح حاصل ہوئی وُہی دن آپ کو اپنے نفس پر سب سے زیادہ عالی شان فتح حاصل کرنے کا دن بھی تھا۔ قریش نے سالہا سال تک جو کچھ رنج اور صدمے دِئے تھے اور بے رحمانہ تحقیر و تذلیل کی مصیبت آپ پر ڈالی تھی۔ آپ نے کشادہ دلی کے ساتھ اُن تمام باتوں سے درگذر کی اور مکّہ کے تمام باشندوں کو ایک عام معافی نامہ دے دیا[۱]۔"

یا شاید ہمارے بعض علمار کے دِل کی آواز یہ کہے کہ مکّہ کے تمام باشندوں کو ایک عام مُعافی نامہ دے دیا۔ اور اہلِ مکّہ کو بزور مُسلمان بنانے کا ایک عظیم الشّان موقعہ خود اپنے ہاتھوں سے کھو دیا۔

مگر واقعات سخت اور بے درد ہوتے ہیں اور کسی کی رعایت نہیں کرتے۔ ہاں مگر واقعات سے آنکھیں موند لی جائیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

اور واقعات سے آنکھیں موندی جا رہی ہیں۔ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سراسر دفاعی جنگوں کو جارحیت اور تشدّد کی جنگیں قرار دیا جا رہا ہے۔ اور حد یہ ہے کہ یہ بے بُنیاد الزام واضح تاریخی حقائق کے خلاف جا کر

---

[۱] "انتخابِ قرآن"۔ مقدمہ ص ۶۷،

لگایا جاتا ہے۔

فتحِ مکّہ سے لے کر وصالِ نبوی تک

ممکن ہے کوئی یہاں پہنچ کر اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ جبری مسلمان کہیں فتحِ مکّہ کے بعد کی جنگوں میں نہ بنائے گئے ہوں۔ مگر فتحِ مکّہ کے بعد کی جنگوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اس وہم کی قلعی کُھل جاتی ہے جو غالب کے اس شعر کے مصداق ہے ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑینگے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہُوا

چنانچہ فتحِ مکّہ کے بعد کے غزوات و سرایا کے اعداد و شمار بھی درج ذیل کیے جاتے ہیں:-

فتحِ مکّہ کے بعد ایسے سرایا جن میں نہ کوئی لڑائی
ہوئی نہ کوئی اسیر ہؤا نہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا = ۔۔۔۔۔ ۳
ایسے غزوات یا سرایا جن میں جنگی قیدی ہاتھ آئے = ۔۔۔۔ ۴
جنگی قیدیوں کی کل تعداد = ۶۰۰۰ + ۶۲ + اسیرانِ بنوطے + ۱

اس دور میں اسیروں کی تعداد گذشتہ سب ادوار سے غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ایک جنگِ حُنین ہی میں چھ ہزار کی تعداد میں دُشمن اسیر ہوئے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ ان اسیروں سے رَحمۃ لِّلعالمین نے کیا سلوک کیا۔ کیا سب تہِ تیغ کر دئے گئے یا نوکِ خنجر سے مُسلمان بنالے

گئے ؛ نہیں ۔ ایک بھی نہیں ۔ بلکہ بلا استثناء سارے کے سارے غیر مشروط طور پر رہا کر دِئے گئے ۔ جنگِ حنین کے چھ ہزار اسیروں کو رَحْمَةً لِلْعَالَمِیْنَ نے نہ صرف قبولِ اسلام کی شرط کے بغیر رہا فرما دِیا ۔ بلکہ ان میں سے بعض کو خلعتیں بھی عطا فرمائیں اور انعام واکرام سے نوازا ۔ رحم وکرم کی حد یہ ہے کہ اُن میں سے بعض قیدیوں کا فدیہ بھی اپنی جیب سے ادا فرمایا ۔ اِسی قسم کے رحم وکرم کا سلوک بنی طے کے اسیران سے کیا اور حاتم کی بیٹی کو تو غیر معمولی اکرام کے ساتھ رُخصت فرمایا ۔

اس کے علاوہ اس دور میں سریّہ عیینہ بن حصین میں قبیلہ بنو تمیم کے باسٹھ[۶۲] اسیر مدینہ لائے گئے ۔ مگر اس قبیلہ کے سردار آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رحم کی درخواست کی ۔ جس پر اس رحمِ مجسّم نے اُن سب کو رہا فرما دیا ۔

آں حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیشہ جو سلوک جنگی قیدیوں سے روا رکھا وُہ نہایت کریمانہ اور فیّاضانہ تھا ۔ ظالم تو ظُلم کا بہانہ ڈھُونڈا کرتا ہے ۔ مگر آپؐ رحم وکرم کا بہانہ ڈھُونڈتے نظر آتے ہیں ۔ بنو ہوازن کے قیدیوں کو معاف کرنے کا واقعہ بھی عجیب ہے ۔ اور اسی ایک واقعہ ہی سے مفتوحین کے بارہ میں آپؐ کے جذبات اور طرزِ فکر کا پُوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے ۔ اِن قیدیوں کے بارہ میں رحم کی درخواست کی غرض سے بنو ہوازن کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اور آپؐ کو حضرت حلیمہؓ دائی کا واسطہ دے کر جو اسی قبیلہ کی تھیں آپؐ سے مُعافی کا طلبگار ہوا ۔ اُس وقت آپؐ نے

اُن سے یہ نہیں پُوچھا کہ اب ہار کھا جانے کے بعد تمھیں اپنے قبیلہ کی وُہ دائی یاد آگئی جس نے مجھے دُودھ پلایا تھا۔ مگر جب تم مکّہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یا جب حنین کی وادی میں مجھ پر اور میرے ساتھ چند نرغے میں آئے ہوئے فدائیوں پر تیروں کی بارش برسا رہے تھے تو اُس وقت کیا تمھیں یاد نہ آیا کہ یہ تو وُہی معصوم یتیم بچّہ ہے جس نے ہمارے قبیلہ میں پرورش پائی تھی؛ نہیں آپؐ نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا۔ بلکہ فرمایا کہ جس قدر قیدی میرے اور بنو عبدالمطّلب کے حصّہ کے ہیں اُن کو لے جاؤ وہ آزاد ہیں۔ یہ چند کلمات آپؐ کے بے مثال خُلق اور گہری فراست پر وسیع روشنی ڈالتے ہیں۔ اوّل تو ایک دُور کی رضاعی ماں کی یاد میں اُس کے قبیلہ کے بعد میں آنے والے ظالموں کو جو اپنی طرف سے تو آپؐ کو ہلاک کرنے کی پوری کوشش کر چکے تھے اس طرح معاف فرما دینا ایک بے حد پیارا اور کریمانہ فعل ہے۔ دُوسرے آپؐ کا یہ فرمانا کہ صرف بنو عبدالمطلب کے حصّہ کے قیدی آزاد ہیں آپ کی فراست اور خُلق کے بعض اَور پہلوؤں پر بھی عجیب روشنی ڈالتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ سب کو معاف کر کے آزاد کر دُوں۔ مگر چونکہ حضرت حلیمہؓ کی رضاعت کا تعلّق محض آپؐ کی ذات یا زیادہ سے زیادہ اِس واسطہ سے آپؐ کے خاندان کے ساتھ ہو سکتا تھا۔ اِس لئے آپؐ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ ایک ذاتی تعلّق کی بناء پر باقی مُسلمانوں کو بھی اِس احسان کا پابند کر دُوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آپؐ کے رحم وکرم کی خصلت تمام انسانوں میں اپنی وُسعت اور گہرائی کے لحاظ سے

بے مثال تھی لیکن غیر متوازن نہ تھی ۔ آپؐ ایک ایسے رحم دل انسان کی طرح نہ تھے جو اپنے رحم و کرم کے جوش میں دوسروں کے حقوق بھی لوگوں کو بخش دیتا ہے ۔ چنانچہ آپؐ نے ایسا نہ کیا ۔ بلکہ جو طریق اختیار کیا وہ جود و کرم کے آسمان پر ہمیشہ چاند ستاروں کی طرح چمکتا رہے گا ۔ آپؐ جانتے تھے کہ اگر اس بارہ میں لوگوں سے مشورہ کرنے کی بجائے مَیں نے قیدیوں کو آزاد کرنے کی ایک عملی مثال قائم کر دی تو کسی مسلمان گھر میں کوئی قیدی نہ رہے گا ۔ پس آپؐ نے ایسا ہی کیا ۔ اور جب آپؐ کے اس فرمان کی خبر عشاقؓ کے کانوں تک پہنچی کہ "میرے اور بنو عبد المطلب کے حصہ کے سب قیدی آزاد ہیں" ۔ تو اُنھوں نے بے اختیار عرض کی کہ اے ہمارے محبوبؐ "مَا کَانَ لَنَا فَھُوَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ" (جو کچھ ہمارا ہے وُہ تو سب رسول اللہ ہی کا ہے) اور یہ کہتے ہوئے اُن قیدیوں کو آزاد کرنے میں ایک دُوسرے پر سبقت لیجانے لگے ۔ اور فضا ، نعرہ ہائے جنگ اور زخمیوں کی آہ و پکار کی بجائے آزادی کے ترانوں سے گُونج اٹھی ۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے حد رحیم و کریم تھے ۔ بنو طیؔ کے قیدیوں کی آزادی بھی آپؐ کے خُلق کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتی ہے ۔ ان قیدیوں کو صرف اِس وجہ سے بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دیا گیا کہ عرب کے ایک مشہور سخی حاتم طائی کی بیٹی جو خود ان قیدیوں میں شریک تھی اپنی آزادی صرف اس شرط پر قبول کرنے کے لئے تیار تھی کہ باقی قیدیوں کو بھی ساتھ رہا کیا جائے ۔ چنانچہ ایک گذرے ہوئے حاتم کی سخاوت کے

نام پر اسکی قوم کے شریروں کو رہا کر دیا گیا اور اس موقعہ پر بنو عبد المطلب کے
قیدیوں کی کوئی شرط نہ رکھی ۔ کیونکہ یہاں جس بنا پر قیدیوں کو رہا کیا جا رہا تھا وہ
سارے عرب میں مشترک تھی ۔ حاتم کی سخاوت ایک قومی سرمایہ تھی جس پر فخر
کرنے میں سارا عرب شریک تھا ۔

ان حالات میں جب نظر پڑتی ہے تو بے اختیار دل آپؐ پر دُرود بھیجنے لگتا
ہے اور کسی طرح یقین نہیں آتا کہ اس سراپا رحمت و شفقت اور سب کریموں سے بڑھکر
کریم نبیؐ پر بھی کوئی یہ الزام لگا سکتا ہے کہ آپکی کوئی ایک جنگ بھی اسلام پھیلانے کی
غرض سے تھی یا اس غرض سے تھی کہ تلوار کے پھل سے دِلوں کی زمین میں ہل چلاکر
اسلام کا بیج بویا جائے ۔ نظریات کی اشاعت کے یہ تصوّرات تو کارل مارکس اور لینین
اور سٹالن کے نظریات تھے ۔ پھر مولانا کیوں نہیں سوچتے کہ اس اشتراکی سطح سے بہت
بالا تھے اُس سیّدِ وُلدِ آدمؑ کے خیالات جس کی اُڑان سدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں تک
تھی ۔ اور جو تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام تک جا پہنچا تھا ۔

مولانا کی سوچی ہوئی پالیسی کو اس رُوحانی پالیسی سے کوئی نسبت نہیں ہے جس کا
الہام آپؐ کی پاک اور شفاف فطرت پر انوارِ سماوی کی صُورت میں نازل ہوتا تھا ۔ اس
رسُولؐ کی پالیسی سے جس کی فراست خُدا کی فراست تھی اور جسے لطیف و خبیر کی طرف سے
ایک نہایت باریک بین نظر عطا ہُوئی تھی ۔ خاک کو بھلا عالمِ پاک سے کیا نسبت
ہوسکتی ہے ۔ مولانا نے جو کچھ کہا بہت بُرا کہا اور ناحق کہا ۔ انہیں کب یہ حق پہنچتا تھا
کہ اپنے گھناؤنے تصوّرات کو اُس انسانِ کاملؐ کی طرف منسوب کرتے ۔ حصولِ اقتدار
کا کیا یہ صرف ایک ہی ذریعہ رہ گیا تھا ؟

تمت بالخیر

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝

پس (اے محمد) نصیحت کر۔ تو محض ایک ناصح ہے۔ ان پر داروغہ نہیں۔

(فرمانِ خداوندی)

ناصحینِ گذشتہ

اور

اس دور کے خُدائی فوجدار

"یہ کوئی مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین اور مبشرین کی جماعت نہیں ہے بلکہ یہ خُدائی فوجداروں کی جماعت ہے۔"

(ارشاد مولوی مودودی)

ناصحینِ گذشتہ اور اس دور کے خدائی فوجداروں کی ایک جماعت

انسانی دستور کے مطابق ہر سچا عاشق اپنے محبوب کا چہرہ حسین دیکھتا ہے اور سچا غلام اپنے آقا کی طرف خوبیاں منسوب کرتا ہے۔ یہ رجحان انسانی فطرت میں اس شدت سے پایا جاتا ہے کہ بسا اوقات ایک عاشق کی آنکھ اپنے محبوب میں وہ حسن بھی دیکھنے لگتی ہے جس کا وہاں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ عشق ہو تو سیاہ فام لیلیٰ بھی حسین دکھائی دینے لگتی ہے اور لیلیٰ کے کتے میں بھی حسن کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس نفرت کی آنکھ سے ہر حسن اوجھل ہو جاتا ہے اور ہر عیب بڑا دکھائی دینے لگتا ہے۔ کسی عرب شاعر نے اسی مفہوم کو بڑی عمدگی سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

وَعَیْنُ الرِّضَا عَنْ کُلِّ عَیْبٍ کَلِیْلَۃٌ
کَمَا اَنَّ عَیْنَ السُّخْطِ تُبْدِی الْمَسَاوِیَا

"رضامندی کی آنکھ ہر عیب کو دیکھنے سے عاجز ہوتی ہے اسی طرح جیسے ناراضگی کی آنکھ برائیوں کو بڑا کر کے دکھاتی ہے۔"

انسانی فطرت کے اس دستور کے پیشِ نظر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اشاعتِ اسلام کے بارہ میں مولوی مودودی صاحب کے بھیانک نظریات پر نظر پڑتی ہے تو طبعاً دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ پھر فطرتِ انسانی کے سراسر خلاف ایسی انوکھی راہ کیوں اختیار کی کہ اُس حسین چہرہ میں عیب دیکھنے لگے جس میں بہت سے غیروں کو

بھی حُسن کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔
اس اُلجھن کے تین ہی ممکن حل میری سمجھ میں آتے ہیں:۔ اوّل یہ کہ یہ غلامی کے سب دعوے غلط ہوں اور حقیقتاً مولانا کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دُور کا بھی تعلق نہ ہو۔ گذشتہ باب میں جو کچھ گزر چکا ہے اگر اُسے دیکھ کر کوئی دوست یہ نتیجہ بھی اخذ کرلیں تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر مَیں سمجھتا ہوں اتنی دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے کسی بھی مسلمان کہلانے والے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمداً دشمنی کا الزام ایک بہت ہی سنگین الزام ہے اور خواہ کیسے ہی قرائن موجود کیوں نہ ہوں کم ازکم میری طبیعت کسی دشمن پر بھی یہ الزام لگانے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ مَیں خود اس مظلوم فرقہ سے تعلق رکھتا ہوں جس کے قلوب میں اگرچہ اُس محبوب ترین نبی کے لئے اتھاہ اور بے پناہ محبّت کے سوا کچھ نہیں مگر پھر بھی ظالموں کی طرف سے اُس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُشمنی کا الزام لگایا جاتا ہے اس لئے مَیں یہ جانتے ہُوئے کہ اس الزام کا زخم کتنا گہرا اور پُر درد ہوتا ہے مودُودی صاحب پر یہ الزام لگانے سے گریز کرتا ہوں۔

دوم:۔ دوسرا حل یہ ہو سکتا ہے کہ مودُودی صاحب کی نظر عیب وہنر کے ادراک کے قابل ہی نہ ہو اور جس طرح بعض لوگ کلر بلائنڈ (colour blind) ہوتے ہیں اور بعض رنگوں میں تمیز نہیں کرسکتے مودُودی صاحب بھی اخلاق کے حُسن و قبح میں تمیز کرنے کی اہلیّت نہ رکھتے ہوں۔ یہ امر قرینِ قیاس ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ جہاں تک اخلاقی قدروں کا تعلق ہے مولانا کی قوّتِ ممیّزہ میں نقص ہو مگر مَیں سمجھتا ہوں کہ دراصل ان کی اس انوکھی طرزِ عمل کا راز مندرجہ ذیل تیسرے

امکانی حل ہیں مضمر ہے۔

سوم:۔ اُردو میں ایک محاورہ ہے "دُھن سوار ہونا" جسے انگریزی میں وسیشن (Obsession) کہا جاتا ہے۔ یعنی دل و دماغ پر ایک خیال کا ایسا چھا جانا کہ دائیں بائیں آگے پیچھے کی ہوش نہ رہے۔ انسانی نظر و فکر کی یہ ایک انتہائی مہلک بیماری ہے جو تپ دق کی طرح اُس کی صلاحیتوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے اور اپنی جلو میں اور بہت سی نظری بیماریاں لے آتی ہے بدقسمتی سے مودودی صاحب بھی اسی مرض کا شکار ہو چکے ہیں اور دُھن ان پر یہ سوار ہے کہ خلقِ خدا کی گردنیں اپنے ہاتھ میں لے کر ڈنڈے کے زور سے اصلاحِ خلق کے وُہ وُہ کام کر دکھائیں کہ جو اُن سے پہلے کبھی کسی راستباز نبی سے بھی سر انجام نہ پائے تھے۔ یہی وہ دُھن ہے جس کے نتیجہ میں وہ ٹھوکر پر ٹھوکر کھاتے ہیں اور دُھند کی طرح یہ اُن کی راہ میں حائل ہو کر اُنہیں وادی وادی بھٹکاتی پھرتی ہے بلکہ بسا اوقات ہلاکت کی اُن راہوں تک جا پہنچاتی ہے جن پر آدمؑ سے لے کر آجتک دشمنانِ حق ہمیشہ چلتے رہے۔ اِسی دُھن کے زیرِ اثر کبھی تو وہ قتلِ مُرتد کے عقیدہ کے قائل ہو کر اُن ازلی ابدی ظالموں کے مسلک کی تائید کرتے ہیں جنہوں نے انبیاء علیہم السّلام اور اُن کی جماعتوں کی محض اس لئے مخالفت کی تھی کہ وہ اپنے پہلے دین سے پھر چکے تھے اور کبھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں تلوار پکڑا کر اشاعتِ اسلام کو نعوذ باللہ اسی تلوار کا مرہونِ منّت قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ تلوار کی ضرورت نصیحت کی افادیت کو باطل ثابت کرتی ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ اگر نصیحت کی افادیت کو تسلیم کر لیا جائے تو تلوار کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لئے مودودی صاحب تلوار باقی رکھنے کے لئے نصیحت

کی احادیث سے انکار کرنے پر مجبور رہیں۔

زیرِ نظر باب میں مودودی صاحب کے یہی نظریات قارئین کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں جو نصیحت کو فضول اور بیکار شئے قرار دے کر مذہب میں تلوار کے استعمال کے لئے ایک وجہ جواز تراشتے ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

"اُن کو آپ محض پند و نصیحت سے چاہیں کہ اپنے فائدوں سے ہاتھ دھولیں تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہاں اقتدار ہاتھ میں لیکر آپ بجبر اُن کی شرارتوں کا خاتمہ کر دیں"[1]

بظاہر یہ اصلاح کا ایک نہایت کارآمد طریق نظر آتا ہے۔ خصوصاً پند و نصیحت کے دشوار گزار رستوں کے مقابل پر اس طریق کی آسانی اپنے اندر ایک گونہ کشش رکھتی ہے۔ کہاں تو اصلاحِ خلق کی خاطر دردمندانہ نصیحت کرتے ہوئے در بدر کی ٹھوکریں کھانا اور ہر در سے دھتکارے جانا مگر پھر بھی ایک ایسے دیوانے عاشق کی طرح بے مثال صبر اور ہمت کے ساتھ اپنے مسلک پر قائم رہنا جس کا نعرہ ہر آزمائش کے وقت یہی ہوتا ہے کہ:۔

یہ تُو نے کیا کہا ناصح نہ جانا کوئے جاناں میں
ہمیں تو راہرووں کی ٹھوکریں کھانا مگر جانا

اور کہاں تلوار کے زور سے آنِ واحد میں جوق در جوق لوگوں کو صالح مسلمان بنا دینا؟ اوّل الذکر طریق کی مشکلات کو مؤخر الذکر طریق کی آسانی کے ساتھ کوئی بھی نسبت ہے؟

طریق اوّل یعنی نصیحت اختیار کر کے کوئی جانتے بوجھتے ہوئے کیوں وہ کٹھن

---

[1] "حقیقتِ جہاد" صفحہ ١

راہیں اختیار کرلے جن پر قدم مارنے کا نتیجہ سوائے اس ذلت و رسوائی کے کچھ نہیں ہوتا جو اس سے پہلے ناصحین کے دکھتے نصیبوں میں لکھی جاتی رہی اور جس کا ذکر قرآن کریم اس الفاظ میں بیان فرماتا ہے :-

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ ○ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ ○ وَاِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰٓی اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ○ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ○ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ○ ترجمہ :- یقیناً مجرم لوگ مومنین سے تمسخر کیا کرتے تھے اور جب اُن کے پاس سے گزرتے تھے تو تحقیر آمیز اشارے کرتے تھے اور اپنے اہل و عیال کی طرف اِتراتے ہُوئے لَوٹتے تھے اور جب ان کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے یقیناً یہی لوگ ہیں جو پکے گمراہ ہیں۔ حالانکہ وُہ ان پر داروغہ مقرر نہیں کئے گئے تھے "

غالباً یہی وجہ ہے کہ مودودی صاحب ہرگز اس اصل کے قائل نہیں کہ اصلاح خلق کی خاطر خواہ مخواہ ایسی پُر مشقت زندگی اختیار کی جائے جس کا نتیجہ جگ ہنسائی اور رُسوائی کے سوا کچھ نہ ہو۔ لوگ ہنسی مذاق کا نشانہ بنائیں۔ سر مٹکائیں اور آنکھوں سے اشارے کریں کہ ان دُنیا کی اصلاح کرنے والوں کو تو دیکھو کہ جن کے پاس نصیحت کے سوا کوئی ہتھیار نہیں اور کمزوری کا یہ حال ہے کہ ہم جب چاہیں انہیں اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں اور دعوے یہ ہیں کہ ہم محض نصیحت کے ذریعہ دُنیا کے دل جیت لیں گے۔ غرضیکہ یہ تمسخر اور تحقیر کرتے ہُوئے لوگ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اتراتے

ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ جایا کریں۔ اور جب کبھی بھی ان ناصحین کا ذکر آئے وہ ان کو سخت گمراہ اور راہِ حق سے بھٹکے ہوئے قرار دیا کریں۔ پھر ایسی نصیحت کا بھلا کیا فائدہ۔ مفت کی رسوائی اور ذلت کے سوا ماحصل کچھ بھی تو نہیں۔ اس کے برعکس ایک طریق ایسا ہے جسے اپنانے سے خلقِ خدا کی خوب خوب اصلاح ہو سکتی ہے۔ اور وہ طریق مودودی صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"جو کوئی حقیقت میں خدا تعالےٰ کی زمین سے فتنہ و فساد کو مٹانا چاہتا ہو اور واقعی یہ چاہتا ہو کہ خلقِ خدا کی اصلاح ہو تو اس کے لئے محض واعظ اور ناصح بن کر کام کرنا فضول ہے۔ اُسے اُٹھنا چاہیئے اور غلط اصُول کی حکومت کا خاتمہ کر کے غلط کار لوگوں سے اقتدار چھین کر صحیح اصُول اور طریقے کی حکومت قائم کرنی چاہیئے"[1]

یہ ہے وہ اصلاحِ خلق کا مودُودی نظریہ جو بعینہٖ اشترا کی نظریہ بھی ہے اور بظاہر بہت ہی زود اثر اور کارآمد دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس سے متأثر ہونے کے بعد طبعًا دل میں یہ سوال اُٹھتا ہے۔ کہ اگر یہ نظریہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے اور اپنے دُور رس نتائج کے اعتبار سے بنی نوع انسان کے لئے عظیم الشان فوائد کا حامل ہے تو لازمًا خالقِ فطرت نے انبیاء علیہم السّلام کو اصلاح کا یہی موثر طریق سکھایا ہوگا اور کتبِ مقدسہ "اُٹھ بندے اُٹھ تلوار اُٹھا" کے نعرہ ہائے جنگ سے بھرپور ہوں گی یہاں تک کہ دوسرے تیسرے فرمانِ الٰہی کے بعد بشدّت یہ تقاضا پایا جاتا ہوگا کہ اے خدائی فوجدارو! نصیحت ایک بیکار چیز ہے اس کا خیال

---

[1] حقیقتِ جہاد صلا

تک دل میں نہ آنے دو اور اگر تم بندگانِ خدا کی اصلاح کا ایک موہوم سا تصوّر بھی رکھتے ہو تو حکومتِ وقت کا تختہ اُلٹ دو اور بزوران کی شرارتوں کا خاتمہ کر دو مگر حیف ہے اِس مکتبِ خیال کے حامیوں پر کہ ایسا ہرگز نہیں حیف کہ معاملہ برعکس ہے اور اِس مسئلہ پر خالقِ فطرت کا فیصلہ مذکورہ بالا اشتراکی اور مودودی نظریہ کے بالکل خلاف نظر آتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی نظر میں تو نصیحت ایک ایسی کار آمد چیز ہے کہ اُس عالمگیر نقصان کے زمانہ میں بھی جبکہ انسانیّت بحیثیتِ مجموعی گھاٹے کی طرف جارہی ہو گی صرف وہی نیک عمل والے مومن کامیاب ہوں گے جن کی نشان یہ ہو گی کہ:۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

وہ حق اور صبر کے ساتھ نصیحت کریں گے۔

صحیفۂ فطرت پر ایک نظر ڈالنے ہی سے انسان اس حقیقت کو پاجاتا ہے کہ روحانی اور اخلاقی انقلابات برپا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو جو ذریعہ اختیار کرنے کی تلقین فرماتا ہے وہ محض حق بات کی نصیحت کرنا ہے۔ دُعا کے ساتھ اور صبر کے ساتھ، صبر کے ساتھ اور دُعا کے ساتھ یہانتک کہ خدا تعالیٰ کے اِس وعدہ کے پُورا ہونے کا دن آجائے کہ:۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝

انجام کار متقیوں ہی کی فتح ہو گی۔

خدا تعالےٰ کے تمام فرستادہ نبی اِسی مکتبِ خیال کے حامی تھے اور ان کا اصلاحِ خلق کا تصوّر جبری اصلاح کے اشتراکی تصوّر کے بالکل برعکس تھا قرآنِ کریم

انبیاء علیہم السّلام کے اس مقدّس گروہ کو مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین اور مبشّرین کی ایک جماعت کے طور پر پیش کرتا ہے جن کے طریقِ کار کا ذکر بنی نوع انسان کی رہنمائی کی خاطر ہمیشہ ہمیش کے لئے اس مقدّس صحیفہ میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ پس اس الٰہی بیان کے مطابق حضرت نوحؑ کا انقلابی ہتھیار بھی نصیحت تھا اور حضرت ابراہیمؑ کا بھی۔ حضرت شعیبؑ کا بھی اور حضرت صالحؑ کا بھی۔ حضرت لوطؑ بھی ناصح ہی بن کر آئے تھے اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ بھی اور سب سے آخر پر مگر ان سب سے کہیں بڑھ کر سیّدِ وُلدِ آدم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی محض ایک ناصح کے طور پر ہی ایک عظیم ترین عالمگیر رُوحانی انقلاب برپا کرنے کے لئے اس دُنیا میں تشریف لائے تھے۔ پھر میں اِس مقدّس زمرۂ انبیاء کی اِس اجماعی سنّت کو کیسے بکسر نظر انداز کر ڈالوں اور مودودی صاحب کے اِس اشتراکی دعوی کو تسلیم کر لوں کہ

"جو کوئی حقیقت میں خدا تعالےٰ کی زمین سے فتنہ و فساد کو مٹانا چاہتا ہو اور واقعی یہ چاہتا ہو کہ خلقِ خدا کی اصلاح ہو تو اس کے لئے محض واعظ اور ناصح بن کر کام کرنا فضول ہے۔"

دیکھئے حضرت نوحؑ کی قوم نے جب آپ پر کھُلی کھُلی گمراہی پھیلانے کا الزام لگایا تو آپ نے قرآن کریم کے بیان کے مطابق انہیں یہی جواب دیا کہ:

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (سورۃ الاعراف: ۶۱-۶۲)

اے میری قوم مَیں گمراہ نہیں ہوں بلکہ ربّ العالمین کی طرف سے

پیغمبر بن کر آیا ہوں اور میرا کام یہ ہے کہ تمہیں اپنے رب کا پیغام
پہنچاتا ہوں اور نصیحت کرتا ہوں اور اپنے رب کی طرف سے
مجھے اُن امور کا علم دیا گیا ہے جنھیں تم نہیں جانتے۔"

یہ ہے وہ خطاب جو اللہ تعالےٰ کے بیان کے مطابق حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کیا مگر مودودی نظریہ کے مطابق اُن کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ "میں تو خدا کا رسول ہوں اور بزورِ شمشیر اپنے صالحین کی جماعت تم پر مسلط کر دوں گا اور خواہ تم ہاتھ اُٹھاؤ یا نہ اُٹھاؤ وہ بہر حال تمہارے غیر صالح ہاتھوں سے اقتدار چھین لیں گے۔"

پھر دیکھیئے حضرت ہودؑ پر جب عاد قوم نے بیوقوف ہونے کا الزام لگایا تو جواباً آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم میری نصیحت کے بے ضرر طریق کو دیکھ کر مجھے بیوقوف نہ سمجھتے رہنا۔ یہ تو ایک عارضی رُوپ ہے ورنہ دراصل میں تو ایک جابر اور متشدد انسان ہوں جو ایک دن خدا کے باغیوں سے عنانِ حکومت چھین کر اپنی صالح جماعت کے سپرد کر دوں گا۔ بلکہ سنّتِ انبیاء کے مطابق آپ کا جواب بھی نہایت ہی پاکیزہ تھا اور اس میں سنگدلی اور جبر و تشدد کے ارادوں کا شائبہ تک نہ تھا قرآن کریم وہ جواب ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ:-

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝ (اعراف: ۶۷-۶۸)

اے میری قوم مجھ میں بیوقوفی کی تو کوئی بات نہیں میں تو تمام جہانوں کے
رب کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں۔ اپنے رب کے پیغام تم تک پہنچاتا
ہوں اور تمہارے لئے ایک ناصح کی حیثیت رکھتا ہوں اور امین ہوں۔"

پھر حضرت ہودؑ کے بعد حضرت صالحؑ کو بھی قوم نے ٹھکرا دیا اور طرح طرح کے الزام لگائے مگر آپ کا جواب بھی یہی تھا کہ:-

یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسَالَۃَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ۝

اے میری قوم دیکھو میں تمھیں اپنے ربّ کا پیغام پہنچا چکا اور نصیحت کر چکا ہوں لیکن تم ناصحین سے محبّت کرنے والے لوگ نہیں ہو۔"

پھر حضرت لوطؑ کی جماعت نے بھی حضرت لوطؑ کی قوم کا اقتدار جبر سے نہ چھینا بلکہ نصیحت کرتے چلے گئے اور ان کے ظلم سے تنگ آکر حضرت لوطؑ کی معیّت میں آخر اپنا وطنِ عزیز چھوڑ کر چلے گئے جسے اُن کے بعد خدا کے عذاب نے گھیر لیا۔

اور حضرت شعیبؑ نے بھی دشمنوں کی ایذا رسانی کے باوجود نصیحت ہی سے کام لیا اور جب مخالف ظلموں سے باز نہ آئے۔ فَتَوَلّٰی عَنْھُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ ۚ فَکَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ کٰفِرِیْنَ ۝ تو وہ اُن لوگوں سے الگ ہو گئے اور کہا کہ اے میری قوم میں تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا چکا ہوں اور نصیحت کر چکا۔ پس کس طرح ایک کافر قوم پر (جو مسلسل انکار پر مُصر ہے) اپنے غم کا اظہار کروں۔

غرضیکہ تمام انبیاءؑ کا مقام ناصحین کا مقام تھا اور جب اُن کا انکار کیا جاتا تھا تو وہ اپنے رب کے حضور جھکتے اور گریہ وزاری کرتے تھے اور بزورِ شمشیر مخالفین سے عنانِ حکومت چھیننے کی بجائے وہ یقین رکھتے تھے کہ اُن کا فرض صرف محبّت اور نرمی اور عجز اور نصیحت کے ساتھ اصلاح کرنا ہے باقی خدا کا کام ہے۔ وُہ مالکِ حقیقی ہے۔

اور جسے چاہتا ہے حکومتوں کا وارث بنا دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ان کا نعرہ بھی یہی تھا کہ رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ٥ اور اپنی قوم کو یہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا۔ اللہ تعالےٰ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ٥ یقیناً ساری زمین خدا تعالےٰ کی ملکیت ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث کر دیتا ہے (یہ ہمارا کام نہیں کہ اپنے زعم میں اپنے آپ کو صالحین کہکر بزور اقتدار حاصل کریں) ہاں ہم اتنا ضرور جانتے ہیں وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ کہ انجام کار فتح بہرحال متقیوں کو نصیب ہوگی۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیلسےؑ نے بھی اپنی ساری زندگی نصیحت میں صرف کردی اور کبھی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے کی سکیمیں نہ بنائیں اور آخر میں سب نبیوں کا سردارؐ بھی ناصح بن کر ہی لوگوں کو نیکی کی طرف بلانے کے لئے آیا داروغہ یا خدائی فوجدار کی حیثیت کبھی اختیار نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی خود آپؐ کو ناصح ہی کا نام دیا اور فرمایا۔

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۗ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ٥

پس (اے محمدؐ) نصیحت کر تو محض ایک واعظ ہے۔ اور ان (لوگوں) پر داروغہ مقرر نہیں"

مگر مودودی صاحب اس دعویٰ پر مُصر ہیں کہ وہ اور ان کی جماعت:۔

"نہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین اور مبشرین کی جماعت نہیں ہے بلکہ یہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے۔ لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔

اور اس کا کام یہ ہے کہ دُنیا سے ظلم، فتنہ و فساد، طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹائے۔[ل]

خدا تعالیٰ تو اپنے بزرگ ترین رسولؐ کو بھی یہی نصیحت فرماتا رہا ہے کہ:۔

وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝

نہ تو ہم نے تجھے اُن پر داروغہ مقرر کیا ہے اور نہ تو اُن کے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

مگر مودودی صاحب داروغگی ہی کے نہیں بلکہ فوجداری کے حقوق اپنے لئے اور اپنی جماعت کے لئے محفوظ کروا رہے ہیں۔ کس قدر تعجب ہے کہ خدا تعالےٰ نے اُس مُصلح اعظمؐ کو تو فوجداری حقوق نہ سونپے جس کی خاطر کائنات کو پیدا کیا گیا تھا مگر مودودی صاحب اور اُن کے صالحین کی جماعت کو اِس عطائے خاص کے لئے چُن لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پُرشفقت و رحمت دل سے جب دردناک دُعائیں اُٹھتی تھیں۔ کہ اے میرے آقا! مجھے توفیق بخش کہ میں سارے جہان کی ہدایت کا موجب بن جاؤں تو آپؐ کو خدا تعالےٰ یہی جواب دیتا رہا کہ:۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

کیا تو لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں۔

اور آپؐ کے منکرین سے متعلق یہی اطلاع دیتا رہا کہ:۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۚ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝

اگر اللہ تعالےٰ چاہتا تو وہ کبھی شرک نہ کرتے۔ اور تجھے ہم نے اُن پر داروغہ مقرر نہیں کیا نہ ہی تو اُن پر نگران ہے۔

ل حقیقتِ جہاد صفحہ ۵۸

مگر مودودی صاحب نے جب اصلاحِ خلق کا ارادہ کیا تو مع جبر و اکراہ کی ساری قوتیں انہیں سونپی گئیں اور تمام فوجداری اختیارات ودیعت کیے گئے تاکہ دنیا سے ظلم، فتنہ و فساد، ناجائز انتفاع اور طغیان کو بزور مٹا ڈالیں۔

کس قدر افسوس ہے اور کیسا تعجب ہے کہ فتنہ و فساد مٹانے اور خلقِ خدا کی اصلاح کرنے کا یہ طریق تمام انبیائے گزشتہ کی نظر سے پوشیدہ رہا اور کسی نے بھی اس انمول راز پر اطلاع نہ پائی یا پھر شاید (نعوذ باللہ) خدا تعالےٰ ہی سے چوک ہوئی۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ اُس نے اصلاحِ خلق کا ارادہ کیا اور ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ وہ یہ بھول جاتا رہا کہ "محض واعظ اور ناصح بن کر کام کرنا فضول ہے" یہانتک کہ نبیٔ آخر زمان، سب نبیوں کا سردار بھی آیا اور گزر گیا مگر پھر بھی خدا تعالیٰ کو نصیحت کی بے مائیگی یاد نہ آئی، اگر کچھ یاد آیا تو اصلاحِ خلق کا وہی ازلی اور ابدی گُر کہ:-

فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى

نصیحت کر۔ یقیناً نصیحت فائدہ بخشتی ہے۔

اگر مودودی صاحب راستی پر ہی ہیں تو بھی بخدا مجھے اِس مودودی سچّائی کی کچھ بھی پروا نہیں کیونکہ اصلاحِ خلق کا وہ انمول راز جو میرے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر نازل نہیں ہوا۔ اگر دس کروڑ مرتبہ بھی آپؐ کے بعد کسی مودودی دل پر نازل ہو تو دس کروڑ مرتبہ میرے دل کی آواز یہی نالہ کرتی ہوئی بلند ہو گی کہ:-

تھا جنہیں ذوقِ تماشہ وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تُو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا؟

اقتدار کی تڑپ

مودودی صاحب کی مختلف کتب کے مطالعہ کے بعد میں اس یقینی نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ موصوف کی نفسیات کے تجزیہ کا ماحصل ان تین لفظوں میں سمٹا ہوا ہے "اقتدار کی تڑپ" ــــــ

یہ اقتدار کی تڑپ ایسی بے حد و بے پناہ ہے کہ اُن کے ہر نظریۂ حیات پر مسلط ہو چکی ہے۔

ان کے نزدیک عبادتِ الٰہی کا مفہوم بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کے بعض بندوں کو صالح بنا کر دوسرے بندگانِ خدا پر حکومت کرنے کا اہل بنایا جائے اور عبادتوں کے روحانی پہلو کی طرف ذرا بھی اُن کی نگاہ نہیں اُٹھتی وہ بھول جاتے ہیں کہ عبادت کی بنیادی غرض بندے کا خدا تعالےٰ سے وصال کرانا ہے، یعنی اُس مقصد کا پورا کرنا ہے جس کی خاطر جنّ و انس پیدا کئے گئے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ عبادت کائنات کی تخلیق کا مقصود ہے۔ کسی ثانوی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ عبادت جنّ و انس کی خاطر پیدا نہیں کی گئی بلکہ جنّ و انس عبادت کی خاطر پیدا کئے گئے ہیں۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے مَا خَلَقْتُ

الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ○ ہم نے عبادت کی خاطر ہی جن و انس پیدا کیے ہیں۔ مگر مولانا کا اصرار ہے کہ:-

"یہ نماز اور روزہ۔ یہ زکوٰۃ اور حج در اصل اسی تیاری اور تربیت کے لئے ہیں جس طرح تمام دنیا کی سلطنتیں اپنی اپنی فوج پولیس اور سول سروس کے لئے آدمیوں کو پہلے خاص قسم کی ٹریننگ دیتی ہیں۔ پھر اُن سے کام لیتی ہیں اسی طرح اسلام بھی ان تمام آدمیوں کو جو اس ملازمت میں بھرتی ہوں پہلے خاص طریقہ سے تربیت دیتا ہے پھر اُن سے جہاد اور حکومتِ الٰہی کی خدمت لینا چاہتا ہے[1]"

عبادت کا اس خوفناک حد تک مادی نظریہ یقیناً دنیا کے کسی مذہب نے کبھی پیش نہیں کیا۔ مگر جب اقتدار کی بے پناہ تمنّا ہر نظریۂ حیات پر مسلط ہو چکی ہو تو بعید نہیں رہتا کہ عبادتِ الٰہی بھی فوج، پولیس اور سول سروس کی ٹریننگ کی طرح نظر آنے لگے۔

اور یہ اقتدار کی تمنّا ایسی بے صبر و بے قرار تمنا ہے کہ کسی مشکل اور لمبی (مگر درست) راہ کو اختیار کر کے حصولِ مقصد کی اجازت نہیں دیتی۔ اشتراکیت کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ انقلاب کے لئے لمبے جمہوری طریق کو اختیار کرنا عبث ہے بلکہ کمیونسٹ پارٹی اپنے "نیک مقصد" کے حصول کی خاطر جب بھی موقع پائے حکومتِ وقت کا تختہ اُلٹ کر عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ مولانا کا بھی بعینہٖ یہی دعویٰ ہے۔ ایک سرِ مُو فرق نہیں۔ چنانچہ مودودی فرمان اپنے متبعین

---

[1] حقیقتِ جہاد صفحہ ۱۶

سے یُوں تقاضا کرتا ہے:۔

"جس سرزمین میں بھی تمہاری حکومت ہو وہاں خلقِ خُدا کی اصلاح کے لئے اُٹھو۔ حکومت کے غلط اصُول کو صحیح اصُول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ ناخدا ترس اور شتر بے مہار قسم کے لوگوں سے قانون سازی اور فرمانروائی کا اقتدار چھین لو۔"[1]

حیرت کی بات ہے کہ مولانا اقتدار کی تمنّا میں ایک ہزاروں سال کے آزمودہ عام اخلاقی نکتہ کو سمجھنے سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں اور وُہ نکتہ یہ ہے کہ دعاوی خواہ کتنے ہی بلند بانگ ہوں اور نیّتیں خواہ بظاہر کیسی ہی نیک کیوں نہ ہوں مُلک کی کسی پارٹی کو لڑ کر حکومت پر قبضہ کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ورنہ دُنیا میں ایک ایسا فسادِ عظیم برپا ہو جائیگا کہ تاقیامت مٹ نہ سکے گا اور خانہ جنگیوں کی ایسی آگ بھڑکے گی کہ بُجھائے نہ بُجھے گی۔

اوّل تو اس امر کا فیصلہ کہ جس مقصد کے لئے کوئی پارٹی کھڑی ہوئی ہے وُہ نیک ہے بھی یا نہیں خود اسی پارٹی پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ دُوسرے اگر بالفرض اُسے نیک تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس فیصلہ کا اختیار بھی اسی پارٹی کو نہیں دیا جا سکتا کہ برسرِ اقتدار لوگ تو سارے بدکردار، ناہنجار، ناخدا ترس اور شتر بے مہار ہیں مگر اس پارٹی کے سارے افراد نیک اور صالح ہیں اور اُن کے دلوں کی نیّتیں سیدھی اور صاف ہیں۔ اور اگر یہ نیّتیں نیک بھی تسلیم کر لی جائیں تو اس خطرہ کا کیا علاج کہ بعض اوقات ابتداءً تو نیّتیں نیک ہی ہوتی ہیں یا انسان

---

[1] حقیقتِ جہاد صفحہ ۱۵

اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ نیک ہیں ؛۔

"لیکن حکومت اور فرمانروائی جیسی کچھ بد بلا ہے ہر شخص اُس کو جانتا ہے۔ اُس کے حاصل ہونے کا خیال کرتے ہی انسان کے اندر لالچ کے طوفان اُٹھنے لگتے ہیں۔ خواہشاتِ نفسانی یہ چاہتی ہیں کہ زمین کے خزانے اور خلقِ خدا کی گردنیں اپنے ہاتھ میں آئیں تو دل کھول کر خدائی کی جائے[1]"

پس جب خود مولانا کو بھی یہ تسلیم ہے کہ اقتدار کی تمنّا تو خیر الگ رہی اُس کے حاصل ہونے کا خیال ہی ایک نہایت خطرناک تبدیلی دل میں پیدا کر سکتا ہے تو پھر اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ اُن کے تیار کردہ "صالحین" اس خطرناک مقام سے محفوظ گزر جائیں گے۔ اگر کہیں کہ اُن کی نیک نیتی کی ضمانت اس وجہ سے لی جا سکتی ہے کہ وہ اس ٹریننگ میں سے گزر چکے ہوں گے جو اس "سول سروس" کے لئے اللہ تعالےٰ نے مقرر فرمائی ہے۔ یعنی تمام عباداتِ اسلامی بجا لانے والے ہوں گے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ فرض کہاں سے کر لیا کہ صرف اُن کی "اسلامی جماعت" کے اراکین ہی نماز، روزہ، حج زکوٰۃ وغیرہ کے فرائض ادا کرتے ہیں؟ اگر احمدیوں کی عبادتیں آپ کے نزدیک عبادتیں نہ بھی ہوں تو کیا بریلوی کلّیۃً ان عبادات کے تارک ہیں یا دیوبندی اِن سے بیزار ہو چکے ہیں؟ کیا شیعہ خیال کے مسلمانوں کی عبادتیں عبادتیں نہیں اور اہلِ قرآن ان کو یکسر ترک کر بیٹھے ہیں؟ پھر ان سب کو کیوں حق نہیں

---

[1] حقیقتِ جہاد صفحہ ۱۵ ؛

پہنچتا کہ وہ بھی اپنے اپنے رنگ میں بزورِ شمشیر ہر وقت اُس حکومتِ وقت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرتے رہیں جو اُن کے مکتبِ خیال کے مطابق فاسد نظریات پر مبنی ہو۔ پھر غیر مسلم بھی تو اپنی اپنی جگہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ سمجھتے تو کیا فوج در فوج اسلام میں نہ داخل ہو جاتے؟ اس لئے اُن کو بھی اُصولاً یہ حق ملے گا کہ حکومتِ وقت کا تختہ اُلٹنے کے لئے ہر وقت ریشہ دوانیوں میں مصروف رہیں۔

نیک ارادوں یا اصلاحِ خلق کے بہانے صالحین کی مختلف پارٹیوں کو حکومتوں کا تختہ اُلٹنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کسی کی صالحیت کے بارہ میں اُن کے اختلافات ایسے شدید اور سنگین ہو سکتے ہیں کہ اگر دونوں کو تسلیم کیا جائے تو کوئی پارٹی بھی صالح نہ رہے۔ اسی مثال پر غور کریجئے کہ مولانا کے نزدیک احمدیت کا اسلام سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ یہ اُمتِ محمدیہ میں فساد برپا کرنے کے لئے انگریزوں کا خود کاشتہ پودا ہے جو اُنہوں نے اس غرض سے لگایا تھا کہ مسلمانوں کو جہاد سے متنفر کیا جائے اور اُن کی قوتِ عمل کو زائل کر دیا جائے۔ احمدیت کا بیج اس لئے بویا گیا ہے کہ مسلمانوں میں باہم اختلافات پیدا کر دیئے جائیں اور مارِ آستین کی طرح یہ جماعت اسلام میں شامل ہو کر ایک خفیہ مگر سخت مہلک حملہ کے ذریعہ اسلام کی بیخکنی کر دے۔

مگر میرے نزدیک جماعتِ احمدیہ خالصتہً اسلام کے غلبہ اور احیائے نَو کی خاطر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بیج انگریز نے نہیں بلکہ خود اُس خُدا نے اپنے ہاتھ سے بویا ہے جس نے اُمتِ محمدیہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی اصلاح

کیلئے ایک مہدی عطا کریگا اور ایک ایسا مسیح نازل فرمائیگا جو اپنے ناقابلِ تردید دلائل کے ذریعہ صلیب کو پارہ پارہ کر دیگا۔ پس میرے نزدیک یہ جماعت اسی مہدی اور مسیح کی جماعت ہے، چنانچہ ایک طرف تو یہ بنی نوع انسان کی اصلاح کی غرض سے بے غرضانہ اور درویشانہ وعظ و نصیحت کے کام میں مصروف ہے اور دوسری طرف زمین کے کناروں تک عیسائیت سے مصروفِ پیکار ہے۔ اور ہر میدان میں اسے شکست دے رہی ہے۔ میں بھلا کس طرح باور کروں کہ یہ انگریز کا خود کاشتہ پودا ہے۔ کیا انگریز کے خود کاشتہ پودے کا یہی کام تھا کہ وہ انگریز کے مذہب یعنی عیسائیت کے پودے کی بیخ کنی کردے اور ہر سرزمین سے اس کی جڑیں اکھاڑ پھینکے جہاں جہاں یہ پہنچے تثلیث کے پودے سوکھنے لگیں اور توحید کے بیج بوئے جائیں۔ یہ بیج سرسبز اور شاداب لہلہاتی ہوئی کونپلوں کی صورت پھوٹیں اور جلد جلد بڑھنے لگیں تنومند اور جوان ہوں اور پھولیں اور پھلیں۔ ان کے پھول حسین اور معطر ہوں۔ پھل خوش منظر اور میٹھے اور سبز شاخوں کے سائے تسکین بخش ہوں۔ سعید روحیں پرندوں کی طرح اُن کی ڈالی ڈالی پر وحدت کے گیت گائیں۔ اگر انگریز کے خود کاشتہ پودوں نے یہی کام سرانجام دینے تھے تو کاش ــــ میں سوچتا ہوں، کہ انگریز اپنے دورِ حکومت میں ان صفات کے اَور بھی دو چار خود ساختہ پودے لگا جاتے تاکہ اسلام کل زندہ ہونے کی بجائے آج زندہ ہو جاتا اور عیسائیت کل مرنے کی بجائے آج مرجاتی۔

اب دیکھئے کہ احمدیت کے بارہ میں میرا یقین اور ایمان اُس فتویٰ سے کتنا مختلف ہے جو مولانا مودودی اس جماعت کے بارہ میں صادر فرماتے ہیں۔

مَیں تو اس جماعت کی عمارت کو اس گہرے عشق پر قائم دیکھتا ہوں جو غیر متزلزل طور پر اس جماعت کے بانیؑ کے دل میں خدا اور اُس کے رسولؐ کے لئے جاگزیں تھا اور جس کا اظہار آپؑ اپنے ایک شعر میں اس طرح فرماتے ہیں کہ:۔

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمّرم
گر کفر ایں بوَد بخدا سخت کافرم

"مَیں تو خدا کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عشق میں مخمور ہوں۔ اگر کفر یہی ہے تو خدا کی قسم مَیں سخت کافر ہوں"

مگر مولانا کے نزدیک اِس جماعت کی بنیادیں سر زمینِ انگلستان میں گڑی ہوئی ہیں۔ کیا کوئی بھی نسبت ہے ان دونوں اعتقادات میں؟

پھر اِس مثال کو اُلٹا کر اس طرح بھی ملاحظہ فرمایئے کہ مولانا کے نزدیک "جماعتِ اسلامی" اس لئے قائم کی گئی ہے کہ "صالحین" کی ایک جماعت تیار کی جائے جو اسلامی عبادات کو لمبے عرصہ تک نہایت سختی کے ساتھ ادا کرنے کے بعد اس قابل ہو جائے کہ اسلام اُن سے کہہ سکے کہ:۔

"ہاں اب تم رُوئے زمین پر خُدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہذا آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کردو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو"

چنانچہ مولانا کی کوششوں سے رُوئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ "صالح" بندوں کی جماعت تیار ہو چکی ہے اور اب صرف اس بات کا انتظار ہے کہ کب اتنی طاقت پیدا ہو کہ "لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل"

کر کے" حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں" لے لئے جائیں۔

مولانا سمجھتے ہیں کہ یہ جماعت خالصتہً دنیا کی اصلاح اور اسلام کا بول بالا کرنے کی غرض سے قائم کی گئی ہے تاکہ غیر اللہ کا تصور مٹا دیا جائے اور بزورِ شمشیر سر خدا کی عظمت کے سامنے خم کر دیئے جائیں۔

مگر میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے کہ مودودی جماعت کے اراکین" رُوئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے" ہیں۔ میرا یہ ایمان ہے کہ اگرچہ ہمیں یہ حق تو حاصل ہے کہ ہم عقائد کی رُو سے کسی جماعت یا مذہب سے متعلق یہ فیصلہ کریں کہ وہ حق و صداقت پر مبنی ہے مگر ہمیں یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ اس دنیا میں اپنے متعلق یہ فتویٰ دیں کہ ہم نیک اور صالح ہیں سوائے اس کے کہ صالحیت کے غیر مشکوک آثار ظاہر ہوں اور اللہ تعالےٰ کے پیار کی علامات نظر آنے لگیں۔ جس طرح وہ پہلے اپنے پیارے صالحین سے ہمکلام ہوتا رہا ہے اب بھی ہمکلام ہو۔ جس طرح وہ پہلے اُمت کے صُوفیاء اور بزرگان پر ظاہر ہوتا رہا ہے اب بھی دعویداران صالحیت پر ظاہر ہو۔ اُن کی نصرت فرمائے اور اپنی قولی اور فعلی شہادت سے یہ بات ثابت فرما دے کہ صالحیت کا دعویٰ کرنے والے واقعی صالح ہیں ورنہ انسان ریاکاری اور خوش فہمیوں کے چکر میں ایسا پھنسا ہوُا ہے کہ اُسے خود اپنے نفس ہی کی خبر نہیں۔ وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے جو دلوں کے ہر راز سے واقف ہے اور فطرتِ انسانی کے پاتال تک کی خبر رکھتا ہے کہ کون صالح ہے اور کون غیر صالح ہے۔

پس میرے نزدیک مودودی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ اور یہ بھی بالکل غلط ہے کہ "جماعتِ اسلامی" اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے۔ کیونکہ اگر اس جماعت کے وہی عقائد ہیں جو مولانا مودودی کے ہیں تو یہ اسلام کا بول بالا نہیں کر رہی بلکہ اسلام کو دنیا کی نظروں میں حقیر کر رہی ہے اور طبیعتوں کو اس پاک مذہب سے سخت متنفر کر رہی ہے۔ پاکستان کی مسلمان اکثریت کے ماحول میں بیٹھے ہوئے مولانا مودودی اسلام کے بول بالا ہونے کے جس قدر نعرے چاہیں لگا لیں مگر ذرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی "اشاعتِ اسلام" اور آپ کی "پالیسی" کے بارہ میں اپنے نظریات لے کر غیر اسلامی ملکوں میں تبلیغ کے لئے تو نکل کر دیکھیں خوب کھل جائے گا کہ ان نظریات سے اسلام کا کس قدر بول بالا ہو رہا ہے۔ ذرا اس عقیدہ کو ہاتھ میں لے کر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی تک آسمان پر زندہ موجود ہیں کسی عیسائی ملک کو اسلام کی طرف بلا کر تو دیکھیں اور اس ہتھیار سے کسرِ صلیب کی کوشش تو کریں پھر میں ان سے پوچھوں گا کہ بتائیے یہ مودودی نظریات اسلام اور اس کے مقدس رسولؐ کے نام کا بول بالا کر رہے ہیں یا صورت برعکس ہے۔

سچ یہی ہے اور اسی پر میرا ایمان ہے کہ ان نظریات سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سخت ہتک لازم آتی ہے۔ اس لئے مَیں مودودی جماعت کو ہرگز اسلام کا دوست نہیں سمجھتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے اس جماعت میں اور اس کے طریقِ کار میں اشتراکیت کی بُو آتی ہے اور اس کا بیج سرزمین روس میں بویا ہوا دکھائی دیتا ہے اور روحانیّت کا کُلّی فقدان نظر آتا ہے۔

اب دیکھ لیں کہ ہمارے دعاوی ہیں اپنی نظر میں کتنے معصوم اور کتنے نیک دکھائی دیتے ہیں مگر جب ایک دوسرے کی نظر سے ان کو دیکھیں تو ...... الامان والحفیظ!

اس مثال کو اگر اُمت کے باقی فرقوں پر پھیلا دیا جائے اور ہر ایک کا ہر ایک سے اسی طرح موازنہ کیا جائے تو اس نظریہ کی قلعی کھل جائے گی کہ انسانوں کی اصلاح کی خاطر اور فساد اور ظلم اور طغیان کو دنیا سے دُور کرنے کے لئے لڑ کر حکومت پر قبضہ کرنا جائز ہے۔

مَیں جب اس مودودی نظریہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے انگریزی کا وہ مقولہ یاد آجاتا ہے کہ

"جہنّم کا راستہ نیک نیتوں" کی اینٹوں سے بنا ہُوا ہے"۔

اور آخری حتمی فیصلہ طلب کرتے ہوئے جب مَیں قرآن کریم پر نظر دوڑاتا ہوں تو اس آیت پر نظر ٹھہر جاتی ہے کہ:۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ (بقرہ ع۲)

"جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو مصلحین کی جماعت ہیں۔ خبردار! یہی فسادی ہیں مگر جانتے نہیں"۔

اللہ اللہ! کتنا پیارا کلام ہے اور اس چھوٹے سے کلمہ میں کیسی کیسی ابدی صداقتیں بھری ہوئی ہیں۔ اس آیت کا ایک ایک جزء اپنے اندر فطرتِ انسانی کے گہرے راز لئے ہوئے ہے۔

جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو مصلحین کی جماعت ہیں۔ خبردار! یہی فسادی ہیں مگر جانتے نہیں!

قتلِ مُرتد

مودُودی نظر میں

مولانا کی حصُولِ اقتدار کی تمنّا ہر قید و بند سے آزاد ہے اور ہر میدان میں اُن کی متشدّد طبیعت کے پہلو بہ پہلو جولانی دکھاتی ہے۔ اُن کا قتلِ مُرتد کا عقیدہ بھی اِسی کا کِھلایا ہُوا ایک گُل ہے اور اپنے مخصوص طریق کے مطابق یہ اس عقیدہ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف منسُوب کرتے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر ایک رسالہ "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" قلمبند فرمایا ہے جس میں نہایت دلیری سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اس نظریہ کو منسُوب کیا ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی اُس فوج کشی سے نظیر پکڑی ہے جو آپ نے منکرینِ زکوٰۃ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے فرمائی تھی۔ جہاں تک مولانا کے پیش کردہ "نقلی" اور "عقلی" دلائل پر تفصیلی بحث کا تعلق ہے یہ امر ایک علیحدہ کتاب کا متقاضی ہے۔ پس مَیں یہاں اُس کے چند

ایک پہلوؤں کے ذکر پر ہی اکتفاء کروں گا۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ اور بھی عُلمائے اسلام نے جو یقیناً نیک دل اور صاف نیّت تھے اس مسئلہ میں ٹھوکر کھائی ہے مگر اُن کی ٹھوکر اور مولانا مودودی کی ٹھوکر میں ایک بھاری فرق ہے اور مَیں پہلے اُسی فرق کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اُن علماء کی غلطی محض ایک فقہی غلطی تھی اور اُن کے نفس کے تشدّد کا اُس میں کوئی دخل نہ تھا۔ چنانچہ باوجود اِس کے کہ وہ دیانتداری سے اس بات کے قائل تھے کہ اسلام میں مُرتد کی سزا قتل ہے اُن کے ہاں مسلمان کی تعریف ایسی وسیع تھی کہ اُس سے اُمّتِ محمّدیہ میں کسی قتلِ عام کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور اس حکم کا اطلاق اُسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ جب کوئی شخص کسی دُوسرے مذہب سے آکر اسلام میں شامل ہو، پھر مُرتد ہو جائے اور واضح طور پر کہے کہ مَیں مسلمان نہیں ہوں۔ اس پر بھی خود اس نظریہ کے حامل علماء میں سے بعض کا یہ فتویٰ تھا کہ ایسے شخص کو توبہ کے لئے غیر معیّن مدّت تک مہلت دینی چاہیئے۔ اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی یہ غلط فہمی اس خواہش کی بناء پر نہ تھی کہ خلقِ خدا کی گردنیں اُن کے ہاتھ میں آجائیں اور وہ دل کھول کر خدائی کریں۔ ہرگز اُنہیں یہ ذوق وشوق نہیں تھا کہ وہ زبردستی پہلے کلمہ گو مسلمانوں پر کفر کے فتوے لگا کر اُنہیں کافر قرار دے لیں۔ پھر قتلِ مرتد کا عقیدہ دامن میں لے کر تاک لگائے بیٹھے رہیں کہ کب اقتدار ہاتھ میں آئے اور کب ہم مرتدین کے خون کے دریا بہا دیں۔

مگر یورپ کی تاریک صدیوں کے راہنمایانِ مذاہب کی طرح جن کے نزدیک عیسائیت سے ارتداد کی سزا قتل تھی اور عیسائیت سے مراد وہ عیسائیت تھی جو اُن کے مکتبِ خیال کے مطابق ہو۔ مودودی صاحب کے نزدیک بھی اِسلام سے ارتداد کی سزا قتل ہے اور اسلام سے مُراد وہ اسلام ہے جسے مودودی صاحب یا اُن کے کوئی جانشین اسلام قرار دیں۔ چنانچہ مودودی دَورِ حکومت" میں اس امر کا آخری فیصلہ بہرحال کسی مودودی حکمران ہی کے ہاتھ میں ہوگا کہ کون مسلمان اور کون مُرتد کے حکم میں آتا ہے۔ یہ فیصلہ کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب غیر مشکوک طور پر مولانا کی تصنیفات میں دیا جا چکا ہے۔

مگر اس بارہ میں مولانا کے تصورات قلمبند کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حتی الامکان اختصار کے ساتھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اس الزام سے بریّت ثابت کروں کہ نعوذ باللہ آپؐ بھی اس عقیدہ کے قائل تھے کہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنے کی سزا اسلامی قانون میں قتل ہے۔

اگر کسی شخص کی طرف کوئی خیال یا فعل منسوب کیا جائے تو طبعًا دل میں ایک سوال اُٹھتا ہے کہ کیا وہ دعویٰ یا فعل اُس شخص کے معلوم اخلاق اور شمائل کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس کسوٹی پر ہم بہت سے امور کو روزمرّہ کی زندگی پر پرکھتے ہیں اور اس کا اطلاق صرف انسان پر ہی نہیں بلکہ دُنیا کی ہر چیز پر ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی آپ سے کہے کہ میں نے جنگل میں ایک گھوڑا دیکھا جو شیر کو چیر پھاڑ کر کھا رہا تھا۔ یا ہرن کا ایک بچّہ دیکھا جس نے

دیکھتے دیکھتے ایک چیتے پر حملہ کر کے اس کے ٹکڑے اُڑا دیئے تو آپ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتے کہ ایسا ہی ہؤا ہو گا کیونکہ یہ دعویٰ گھوڑے اور ہرن کی معلوم خصلت کے صریحًا خلاف ہے۔ اسی طرح یہ قتلِ مرتد کا عقیدہ ظاہرًا ایک ایسا غیر طبعی اور غیر منصفانہ فعل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس نظریہ کو بہر حال منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ آپؐ کا تو پیغام ہی یہی تھا کہ دنیا والے اپنے تمام مذاہب چھوڑ کر آپؐ کا مذہب قبول کر لیں۔ پھر آپؐ خود کس طرح تبدیلیٔ مذہب پر کسی قسم کے جبر کو روا رکھنے کی اجازت دے سکتے تھے۔ جب لوگ کوئی دوسرا مذہب چھوڑ کر آپؐ کے مذہب میں داخل ہوتے تھے اور اس جرم کی پاداش میں اُن کو مارا یا ستایا جاتا تھا تو آپؐ اسے صریح ظلم قرار دیتے تھے اور انسان کی آزادیٔ ضمیر کے خلاف ایک سخت غیر منصفانہ دسترس سمجھتے تھے پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سب عادل انسانوں سے بڑھ کر عدل کرنے والا اور سب منصفوں سے زیادہ منصف مزاج اپنے معاملہ میں اس معیار کو بالکل فراموش کر ڈالے۔ جب لوگ کسی کو تبدیلیٔ مذہب پر ماریں تو انہیں سخت ظالم قرار دے اور جب اپنا مذہب چھوڑ کر کوئی دوسری طرف جائے تو اس کے قتل کا فتویٰ جاری کرے۔ اس قسم کی پالیسی تو کسی دنیا کے سیاستدان کی طرف منسوب کرنا بھی اس کی سخت ہتک سمجھی جاتی ہے کُجا یہ کہ اسے سب نبیوں کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف منسوب کیا جائے۔ اس کے علاوہ اگر آپؐ کے عمومی خُلق کی طرف بھی جس کی بعض جھلکیاں پہلے گذر چکی ہیں

نگاہ کی جائے تو اس عقیدہ کو آپؐ کی طرف منسوب کرنے کی گنجائش نہیں رہتی جس طرح سُورج سے متعلق خواہ ہزار دلائل دیئے جائیں، کوئی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ وہ روشنی کی بجائے تاریکی برساتا ہے اُسی طرح اس انسانِ کاملؐ کی طرف یہ غیر فطری فعل منسُوب کرنیکی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ یہ سرے سے ناانصافی ہے ہی نہیں تو اس کا جواب میرے پاس سوائے ایک سخت حیران خاموشی کے اور کچھ نہیں۔

دوسرا امر قابلِ غور یہ ہے کہ قرآن کریم جو مذاہب کی تاریخ پیش کرتا ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ انبیائے گزشتہ میں سے ایک نے بھی کبھی ارتداد کی سزا موت یا جلاوطنی تجویز نہیں کی۔ اس کے برعکس بلا استثناء ان کے تمام مخالفین نے ارتداد کی سزا موت یا جلاوطنی تجویز کی اور اسی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ خدا تعالےٰ قرآن کریم میں اُن کے اس طریق کو سخت ناپسندیدہ اور قابلِ سرزنش قرار دیتا ہے اور اس کی سزا یقینی ہلاکت اور عتابِ الٰہی تجویز فرماتا ہے۔ پھر مَیں یہ کس طرح تسلیم کرلوں کہ میرے مقدّس آقاؐ نے اُن تمام معصوم انبیاء کی سنّت کو ترک کر کے نعوذ باللہ اُن کے مخالفین کی ناپسندیدہ اور ناجائز سنّت کو اپنا لیا اور اُسی کو صحیح قرار دیا۔ یہ میرے نزدیک سُورج کی طرف تاریکی منسوب کرنے سے بھی زیادہ ناممکن ہے۔ مگر اِس پہلو پر چونکہ کتاب کے پہلے باب ہی میں نہایت تفصیل سے روشنی ڈال دی گئی ہے اس لئے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

تیسرا فیصلہ کُن امر یہ ہے کہ قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کی جو تاریخ پیش کرتا ہے وہ واضح طور پر اس خیال کو باطل اور بے بنیاد قرار دے رہی ہے۔ اور آنحضرتؐ کے زمانہ کی قرآن کریم کی پیش کردہ تاریخ سے متعلق مسلمان علماء تو کیا تمام یورپین مستشرقین بھی خواہ کیسے ہی متعصّب کیوں نہ ہوں یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ یہ بغیر کسی شک کے قابلِ قبول ہے قرآن کریم کے پیش کردہ جن تاریخی حقائق کی طرف مَیں نے اشارہ کیا ہے۔ اُن کا تفصیلی ذکر انشاء اللہ اس باب کے آخر پر کیا جائے گا۔ بہرحال یہ تینوں دلائل اکیلے اکیلے بھی ایسے وزنی اور ٹھوس اور واضح ہیں کہ ان کے مقابل پر ہر دوسری دلیل ٹھکرائی جانے کے لائق ہے۔ اور امور کو چھوڑ کر صرف آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی صفتِ انصاف پر ہی نظر کی جائے تو قتلِ مُرتد کے نظریہ کی عمارت ریت کے قلعہ کی طرح خود بخود مسمار ہو جاتی ہے۔ مودُودی صاحب اگر اس کے مقابل پر یہ دلیل پیش فرمائیں کہ بہت سے جیّد علمائے اسلام اس نظریہ کے قائل تھے تو مولانا کے اس استدلال کو مَیں ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے کوئی شاخ کو اوّل اور جڑ کو آخر کر دے۔ یہ علماء خواہ کتنے ہی بڑے مقام پر کیوں نہ ہوں پھر بھی امورِ شرعیہ میں غلطی سے پاک تھے اس لئے اگر چودہ سو سال میں مختلف اوقات میں پیدا ہونے والے تمام علماء بھی بیک آواز کوئی ایسی بات کہیں جسے تسلیم کر لینے سے حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت، امانت، دیانت اور عدالت پر کوئی حرف آتا ہو تو مَیں اُسے تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوں گا۔ کیونکہ مَیں جانتا ہوں کہ یہ علماء اپنے اعلیٰ

اور بلند مرتبوں کے باوجود ٹھوکر کھا سکتے ہیں اور کھاتے رہے ہیں۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صفاتِ حسنہ غیر مشکوک ہیں۔ اِن علماء کے شدید باہمی اختلافات ہی اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ یہ خطاء سے پاک نہ تھے۔ اگر دس رائیں ایک دُوسرے سے مختلف ہوں تو بہرحال ایک ہی درست ہو گی اور باقی تو غلط ہوں گی بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بھی درست نہ ہو بہرحال قطع نظر اس سوال کے کہ علماء کہیں انفرادی یا اجتماعی ٹھوکر کھا سکتے ہیں یا نہیں ایک امر جو ہر شک سے بالا ہے اور یقیناً درست ہے وہ یہی ہے کہ شاخیں جڑ پر قربان کی جا سکتی ہیں جڑ شاخوں پر نہیں۔ کوئی حدیث جس کے راوی خواہ کتنے ہی سچے ہوں اگر قرآن کریم کی کسی آیت کے یقینی طور پر خلاف ہو تو قرآن کریم کے مقابل پر اُسے کسی حالت میں بھی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح ہر وہ اجماع یا کثرت رائے جو قرآن کریم کے کسی بیان کے یقینی طور پر خلاف ہو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاقِ حسنہ پر بُرے رنگ میں روشنی ڈالے، بغیر کسی تردّد کے معاً ٹھکرا دینے کے قابل ہے۔

اس مختصر بحث کے بعد اب ہم مضمون کے اُس حصہ کی طرف واپس لوٹتے ہیں جہاں ہم نے تسلسل توڑا تھا۔ سوال زیر بحث یہ تھا کہ مودودی صاحب کے نزدیک مسلمان کہلانے والوں کے اس انبوہِ کثیر میں سے کون کون سے فرقے مرتد شمار ہوں گے تا کہ اس امر کا کچھ اندازہ کیا جا سکے کہ اگر کبھی انہیں اقتدار نصیب ہو تو خلقِ خدا میں سے کتنوں کی گردنیں اُن کے ہاتھ میں آجائیں گی۔

مولانا کے نزدیک احمدی تو خیر "مرتد" ہیں ہی اور بہرحال ایک "غیر مسلم"

اقلیت" ہیں لیکن یہ ارتداد اور کفر محض انہی تک محدود نہیں، ان کے علاوہ اہلِ قرآن یعنی پرویز صاحب کے مکتبِ خیال کے لوگ بھی غیر مشکوک طور پر کافر دائرۂ اسلام سے خارج یا بالفاظِ دیگر مرتد متصور ہوں گے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اُن کا کفر "قادیانیوں" سے بھی زیادہ سنگین شمار ہوگا (اس لحاظ سے ممکن ہے اُنہیں نسبتاً زیادہ تکلیفیں دے کر مارا جائے) چنانچہ جماعتِ اسلامی کے ترجمان "تسنیم" میں شائع ہونے والا مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا ایک فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ یہ فتویٰ اُن دنوں کا ہے جب ابھی مولانا امین احسن اصلاحی مودودی صاحب سے برگشتہ نہیں ہوئے تھے اور اُن کا دایاں بازو شمار ہوتے تھے۔ مولانا اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:۔

'بعض لوگ اسلامی شریعت کے اختلافات کا حوالہ دے کر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا تو کوئی امکان نہیں ہے البتہ قرآن کریم کے اصولوں پر اس مُلک میں حکومت قائم کرو۔ اگر یہ مشورہ دینے والوں کا مطلب یہ ہے کہ شریعت صرف اتنی ہی ہے جتنی قرآن میں ہے باقی اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ شریعت نہیں ہے تو یہ صریح کفر ہے اور بالکل اسی طرح کا کُفر ہے جس طرح کا کُفر قادیانیوں کا ہے بلکہ کچھ اُس سے بھی سخت اور شدید ہے۔"[1]

---

[1] ماخوذ از "مزاج شناسِ رسولؐ" صہ ۳۷۲ بحوالہ "تسنیم" ۱۵ اگست ۱۹۵۲ء۔

چلیئے احمدیوں اور اہلِ قرآن کا جھگڑا تو نپٹا لیا گیا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کُفر اور ارتداد بس اِنہی دو فرقوں پر ختم ہو جاتا ہے؟ تو اِس سوال کی تحقیق میں ہم جُوں جُوں موُدودی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں یہ حقیقت کُھلتی چلی جاتی ہے کہ موُدودیت کے سوا موُدودی نگاہ میں ہر دوسری چیز کُفر ہی کُفر ہے۔ چنانچہ "مسلمانوں" کے "مسلمان فرقوں" کا حال دیکھتے ہیں کہ موُدودی صاحب کے نزدیک اُن کا اسلام کتنے پانی میں ہے۔ اس انبوہِ کثیر پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہُوئے موُدودی صاحب فرماتے ہیں :۔

"یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویّہ اسلام کے مقابل تبدیل ہُوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے تسلیم کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ اِن کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستہ پر چلے گی تو اُس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے[1]۔"

پھر فرماتے ہیں :۔

[1] "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصّہ سوم صفحہ ۱۳۰۔

"جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا ...... پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اسکے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔"[1]

اگر ابھی تک غیر مودودی مسلمانوں" سے متعلق مولانا کے فتوٰی کی وضاحت نہ ہوئی ہو تو مزید وضاحت کی غرض سے ایک اور اقتباس پیش ہے:۔

"یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافروں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائمِ اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔"[2]

کیا اِن فتووں کے بعد بھی کسی مزید کفر کے فتوٰی کی ضرورت باقی رہ جاتی

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم صـ۱۳۲ ؛ [2] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم صـ۱۶۶۔

ہے۔ اگر رہتی ہے تو شاید اس خیال سے کہ یہ فتویٰ عامۃ الناس یعنی ۹۹۹ فی ہزار سے متعلق ہو گا مسلمان علماء اور دیگر زعماء پر چسپاں نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ خیال درست نہیں کیونکہ مودودی صاحب کی نظر میں ہر غیر مودودی ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جانے کے لائق ہے:۔

”خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین و مفتیانِ شرع دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ اُن میں سے کسی کی نظر بھی مسلمانوں کی نظر نہیں[1]۔“

قارئین کرام خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اگر راہِ حق سے ہٹ جانے کا نام ارتداد نہیں تو اور کیا ہے؟

مودودی صاحب کے مندرجہ بالا دونوں فتوے پڑھ کر مجھے وہ کہانی یاد آجاتی ہے کہ کسی بادشاہ کو ایک گھوڑا بہت عزیز تھا وہ بہت بیمار ہو گیا بادشاہ کو کہاں برداشت تھی کہ اس کی موت کی خبر سُنے حکم دے دیا کہ جو بھی یہ منحوس خبر سُنائے گا مارا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی اس کا بھی پابند کر دیا کہ ہر آدھ گھنٹہ کے بعد صحت کی اطلاع بھجواتے رہو۔ گھوڑا مشیّتِ ایزدی سے آدھ گھنٹہ کے اندر مر گیا اور افسروں نے پکڑ پکڑوا کر ایک شخص کو یہ خبر سُنانے کے لئے بھجوا دیا۔ اُس نے جا کر دست بستہ عرض کی کہ حضور

[1] ”مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش“ حصہ سوم صفحہ ٩٥۔

گھوڑا بڑے آرام میں ہے۔ کوئی درد محسوس نہیں کرتا۔ کوئی حرکت نہیں کرتا۔ کوئی آواز نہیں نکالتا۔ اس کو سانس نہیں آتا۔ اُس کا دل نہیں چلتا۔ بادشاہ نے تلملا کر کہا۔ پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ مرگیا۔ تو اُس شخص نے جواب دیا کہ دیکھئے یہ حضور ہی فرما رہے ہیں، مَیں نے تو نہیں کہا۔

پس اگر کوئی قوم گم کردہ راہ ہو۔ راہِ حق سے ہٹ چکی ہو۔ تاریکیوں میں بھٹک رہی ہو۔ اس کی نظر مسلمان کی نظر نہ رہی ہو۔ جتنے ٹائپ کافروں میں پائے جاتے ہوں اُس میں پائے جاتے ہوں تو اس قوم کو کافر نہیں تو اور کیا کہا جائے گا؟ مگر شاید مودُودی صاحب کہہ دیں کہ دیکھو تم ہی کہہ رہے ہو۔ مَیں تو نہیں کہتا۔

اس لئے اب بھی اگر کسی کو یقین نہ آئے کہ ایسا ہونا ممکن ہے تو جماعت اسلامی سے الگ ہوجانے والوں سے متعلق ارتداد کا فتوٰی اُس کی تسلّی کے لئے کافی ہوگا:۔

"یہ وہ راستہ نہیں ہے جس میں آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹ جانا دونوں ایک ہوں۔ نہیں۔ یہاں پیچھے ہٹ جانے کے معنے ارتداد کے ہیں"[1]۔

پس اگر جماعتِ اسلامی سے علیٰحدہ ہوکر کسی دُوسری جماعت میں شامل ہوجانے کا نامُ "ارتداد" ہے تو دُوسری جماعت کا نامُ "کفر" نہیں تو اَور کیا ہوسکتا ہے؟

[1] "رودادِ جماعتِ اِسلامی" حصہ اوّل صث۔

لیکن اگر مَیں غلط کہہ رہا ہوں تو مودودی صاحب ہی درست فرمائیں کہ وہ اُن مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو عالم الغیب مانتے ہیں اور آپ کے مادی جسم کا انکار کرتے ہیں۔ اور اُن مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جن کے نزدیک اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر اپنی مُرادیں مانگنی جائز ہیں۔ اور وہ اُن مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے علاوہ باقی سب خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو غاصب کہتے ہیں اور اُن پر اور دیگر صحابہؓ پر بشمولیت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا تبرّا بھیجتے ہیں اور لعنتیں ڈالتے ہیں۔

ویسا جواب نہ دیں جیسے گھوڑے کے مرنے کی خبر دی گئی ہے بلکہ بادشاہ کے الفاظ میں بتائیے کہ اُن کو کیا کہتے ہیں۔

پیدائشی مسلمان

یہاں پہنچ کر ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مُرتد کی سزا قتل ہے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ موُدودی صاحب کے نزدیک اُن کی جماعت کے سوا باقی سب مسلمان کہلانے والے کافر ہیں تو بوجہ اس کے کہ انہوں نے یہ کُفر اپنے ماں باپ سے ورثہ میں لیا ہے خود مولانا کے نزدیک بھی اُنہیں مرتد قرار نہیں دیا جا سکے گا بلکہ "پیدائشی کافر" شمار ہوں گے۔ اس لحاظ سے مولانا پر یہ بڑی زیادتی معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی طرف یہ عقیدہ منسوب کیا جائے کہ وہ تمام "پیدائشی مسلمانوں" کو جن کے ماں باپ بھی اُن کے نزدیک کافر ہیں بیک وقت کافر بھی سمجھتے ہیں اور مُرتد بھی۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ مجھے خود یہ تسلیم

ہے کہ معقولیات کی دُنیا میں ایسا ہونا ناممکن نظر آتا ہے لیکن اگر معقولیات کی دُنیا ہی نہ ہو، اگر تشدّد کی بادشاہی ہو اور عام عقلِ انسانی کو مجال نہ ہو کہ وہاں پَر مار سکے تو کیا تب بھی ایسا ہونا ممکن نہیں ہے : یہاں تو تشدّد کی بادشاہی ہے اور معاملاتِ ملک اس دستور کے مطابق طے پاتے ہیں کہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

پس اس دستور کے مطابق ہر وہ "کافر" جو "مسلمان" کہلاتا ہے اور اپنی قسم کے ہی مسلمان کافروں کے گھر ہی پیدا ہُوا "مرتد" کہلائے گا، اور واجب القتل ہوگا۔ کیونکہ اگر اُن کے جان و مال پر دسترس حاصل کرنی ہے تو سوائے اس کے چارہ نہیں رہتا کہ اوّلاً انہیں پیدائشی مسلمان قرار دیا جائے۔ پھر یہ اصرار کیا جائے کہ وہ بالغ ہونے کے بعد خود ہی کافر ہوئے ہیں۔ کیونکہ اُن کے والدین نے اُن کی ایک کافرانہ ماحول میں تربیت کی تھی اس لئے یہ سارے پیدائشی مسلمان "کافر" مرتد ہیں اور واجب القتل ہیں۔

دیکھئے! کیسا عجیب دستور بادشاہی ہے کہ جہاں تک مودودیت اور غیر مودودیت کا تعلق ہے غیر مودودیت کفر ہے مگر جہاں تک اس اختیار کا تعلق ہے کہ ایک پیدائشی کافر مودودیت کے سوا کوئی اور مذہب اختیار کرے وہ پیدائشی "کافر" "پیدائشی مسلمان" کے حکم میں آجاتا ہے۔

یہ کرشمہ سازی صرف یہیں پر آکر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اگر ایک طرف ایک ایسے "مرتد" کے قتل کا جواز جو پہلے اپنی مرضی سے کُفر چھوڑ کر مسلمان ہُوا

تھا یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب اُسے علم تھا کہ یہ ایک یکطرفہ راستہ ہے۔ اور اس سے واپسی ممکن نہیں تو پہلے مسلمان ہی کیوں ہوا تھا۔ تو دوسری طرف ایک "پیدائشی مسلمان" سے تبدیلیٔ مذہب کا حق یہ کہکر چھین لیا جاتا ہے کہ اگرچہ یہ درست ہے کہ اُس مجبور انسان کا اپنی پیدائش کے حالات پر کچھ اختیار نہیں تھا اور تقدیر الٰہی سے بندھا بندھایا ایک مسلمان گھر میں پیدا ہو گیا مگر پھر بھی اُسے تبدیلیٔ مذہب کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ اس طرح تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔ چنانچہ انہی لاینحل مسائل کی گتھیاں سُلجھاتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:۔

> لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کے معنی یہ ہیں کہ ہم کسی کو اپنے دین میں آنے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔ اور واقعی ہماری روش یہی ہے۔ مگر جسے آکر واپس جانا ہو اُسے ہم پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ یہ دروازہ آمد و رفت کے لئے کھُلا ہُوا نہیں ہے۔ لہٰذا اگر آتے ہو تو یہ فیصلہ کر کے آؤ کہ واپس نہیں جانا ہے۔ ورنہ براہِ کرم آؤ ہی نہیں۔"

مجھے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کی یہ تفسیر پڑھ کر اہلِ قرآن کے لیڈر پرویز صاحب کا وہ فقرہ یاد آجاتا ہے جس میں انہوں نے دوسرے الفاظ میں مودودی صاحب کے اس نظریہ کو یوں بیان کیا ہے:۔

> "مودودی صاحب کا اسلام بھی گویا ایک چُوہے دان ہے "آتو سکتا ہے چُوہا مگر جا نہیں سکتا"۔ (غالباً ان کی یہی سُنّم ظریفیاں

ہیں جو اُنہیں مودودی نظر میں اس قدر مقہور و مغضوب بنا رہی ہیں)

مگر قطع نظر اس امر کے کہ اس تفسیر میں مولانا نے اس آیت کریمہ کا عملاً مذاق اُڑایا ہے۔ اگر کوئی نادان یا مجبور اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے یہ سوال کر بیٹھے کہ درست ہے جو آپ نے فرمایا مگر حضرت —— مَیں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں —— مَیں تو پیدا ہی مسلمانوں میں ہُوا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ یہ "One way Traffic" یعنی یکطرفہ راستہ ہے اور مجھ غریب کو کیا خبر تھی کہ مودودی دَورِ حکومت میں پیدا ہونگا۔ تو اِس سوال کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں دُہراتے ہوئے مولانا ایک عجیب و غریب جواب دیتے ہیں۔ مولانا کی ساری عبارت درج ذیل ہے :۔

"پیدائشی مُسلمان

اس سلسلہ میں ایک آخری سوال اور باقی رہ جاتا ہے جو قتلِ مُرتد کے حکم پر بہت سے دماغوں میں تشویش پیدا کرتا ہے وہ یہ کہ جو شخص پہلے غیر مسلم تھا پھر اُس نے باختیارِ خود اسلام قبول کیا۔ اور اس کے بعد دوبارہ کفر اختیار کر لیا اُس سے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے جان بُوجھ کر غلطی کی۔ کیوں نہ ذمّی بن کر رہا۔ اور کیوں ایسے اجتماعی دین میں داخل ہُوا جس سے نکلنے کا دروازہ اسے معلوم تھا کہ بند ہے۔ لیکن اُس شخص کا معاملہ ذرا مختلف ہے

جس نے اسلام خود نہ قبول کیا ہو بلکہ مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام آپ سے آپ اُس کا دین بن گیا ہو۔ ایسا شخص اگر ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام سے مطمئن نہ ہو اور اس سے نکل جانا چاہے تو یہ بڑا غضب ہے کہ آپ اسے بھی سزائے موت کی دھمکی دے کر اسلام کے اندر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک زیادتی معلوم ہوتی ہے بلکہ اُس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ پیدائشی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلام کے اجتماعی نظام کے اندر پرورش پاتی رہے۔ اِس شُبہ کا ایک جواب اُصولی ہے اور ایک عملی ہے۔ اُصولی جواب یہ ہے کہ پیدائشی اور اختیاری پیرووں کے درمیان احکام میں نہ فرق کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ کسی دین نے کبھی ان کے درمیان فرق کیا ہے ہر دین اپنے پیرووں کی اولاد کو نطرۃً اپنا پیرو قرار دیتا ہے اور اُن پر وہ سب احکام جاری کرتا ہے جو اختیاری پیرووں پر جاری کئے جاسکتے ہیں۔ یہ بات عملاً بالکل ناممکن ہے۔ اور عقلاً بالکل لغو ہے کہ پیروانِ دین یا سیاسی اصطلاح میں رعایا اور شہریوں کی اولاد کو ابتداءً کفّار یا اغیار کی حیثیت سے پرورش کیا جائے۔ اور وہ بالغ ہوجائیں تو اس بات کا فیصلہ اُن

کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے۔ کہ آیا وہ اس دین کی پیروی
یا اس سٹیٹ کی وفاداری قبول کرتے ہیں یا نہیں جس میں وہ
پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح تو کوئی اجتماعی نظام کبھی دنیا
میں چل نہیں سکتا۔[1]"

میں اس سوال کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہوں کہ مولانا کی اس مخصوص طرزِ استدلال سے عقل انسانی مطمئن ہو سکتی ہے یا نہیں میں ذاتی طور پر اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ جب بھی وہ کسی باریک مسئلہ کی فضاء میں قدم رکھتے ہیں ان کی نظر قابلِ رحم حد تک دھندلا جاتی ہے اور مختلف شکلوں اور تصاویر میں فرق نہیں کر سکتے۔ اُن کے اسلامی نظریہ ریاست پر جو دُھند طاری ہے اور جس کی بناء پر انہوں نے فاش نوعیت کی بنیادی غلطیاں کی ہیں اس وقت اُن کے ذکر کا یہاں موقعہ نہیں ورنہ ایک کتاب اندر کتاب بن جائے۔ البتہ اس استدلال سے متعلق جو ابھی قارئین کی نظر سے گذرا ہے۔ میں مولانا کی توجہ ایک چھوٹی سی فروگذاشت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کی درستی اُن کے نظریۂ استبداد میں مزید وسعتیں پیدا کرنے کا موجب ہو گی۔

اس دلیل کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ "ہر دین اپنے پیروؤں کی اولاد کو فطرۃً اپنا پیرو قرار دیتا ہے۔" اس لئے مسلمان کہلانے والوں کی اولاد (خواہ اُس اولاد کے ماں باپ مودودی صاحب کی نظر میں عملاً

[1] "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" صـ۷۶ ۔ صـ۷۷ ۔

کافر ہی ہوں) بہرحال اسلام کی جائداد کہلائے گی۔ پس جب اسلام کی ملکیت اُن پر ثابت ہوگئی تو سنِ بلوغت کے بعد انہیں کس طرح اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ جو چاہیں بن جائیں۔ یہ نظریہ قائم فرماتے وقت غالباً مولانا کی نظر سے وہ ارشادِ نبویؐ اوجھل رہ گیا تھا کہ:۔

مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاہُ
یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ۔ (البخاری)

"ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ اُس کے ماں باپ کا دخل ہوتا ہے جو اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں"۔

اگر مولانا کا مذکورہ بالا استدلال درست ہے تو پھر اس کے نتیجہ کو مسلمان کہلانے والوں کی اولاد تک ہی کیوں محدود رکھا جائے ساری دنیا کے بچے اسلام کی وراثت ہیں۔ اُن کو کیوں اس سعادت سے محروم رہنے دیں۔ اور کیوں ان کے ماں باپ کو یہ اختیار دے دیں کہ سنِ بلوغ تک پہنچنے سے پہلے پہلے انہیں ابتداءً کفّار یا اغیار کی حیثیت سے "پرورش" کریں۔ تعجّب ہے کہ یہ حدیث ان کی نظر سے کس طرح رہ گئی۔ یہ دلیل تو نعوذ باللہ تشدّد پسندوں کی بنیادی دلیل ہونی چاہیئے تھی کیونکہ اس کی پہنچ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ کفّار تک بھی ممتد ہے اور دُنیا کے کونے کونے میں ہر

مذہب و ملت ہر کالے گورے پر اس کا وار یکساں پڑتا ہے اگر نعوذ باللہ اس کے وہی معنے لئے جائیں جو مودودی طرزِ استدلال سے نکلتے ہیں تو پھر تو ایک بھی کافر بچہ ہاتھ سے نکل کر نہیں جا سکتا۔

بہرحال میرا کام صرف توجہ دلانا تھا۔ آگے مولانا کو اختیار ہے۔ مَیں تو نہ اُنہیں زبردستی کسی بات کا قائل کر سکتا ہوں نہ اس بات کا خود قائل ہوں کہ اعتقادات اور خیالات کے بارہ میں کوئی زبردستی کی جا سکتی ہے۔

میرے نزدیک تو یہ ناممکن ہے کہ کوئی سچا مذہب صداقت کی تعلیم دیتے ہوئے کسی کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرے۔ کیا کبھی سچ کے بیج سے جھوٹ کی کونپلیں پھوٹ سکتی ہیں یا جھوٹ کی گٹھلی سے صداقت کا درخت اُگا ہے؟ کیا کبھی گندم کے دانوں سے کچلے کے پودے نکلتے دیکھے ہیں؟ اگر ایسا ہونا ممکن نہیں تو پھر کیسے ممکن ہے۔ کہ اسلام جو کہ ایک مجسم صداقت ہے خود بنی نوع انسان کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرنے لگے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جس کا دل اسلام کی صداقت کا قائل نہ رہا ہو اور خدا کی لاشریک وحدانیت کو تسلیم نہ کرتا ہو اور اپنی حماقت سے اس عقیدہ پر تسلّی پا گیا ہو کہ مسیح خدا کا بیٹا تھا اور اس کی خدائی میں شریک تھا تو ایسے شخص کے سامنے اسلام تلوار لے کر کھڑا ہو جائے کہ پہلے کہا کیوں تھا کہ خدا ایک ہے۔ اب تو خواہ تم مانو نہ مانو تمہیں یہی

کہنا پڑے گا کہ وہ ایک ہے۔ ایک ہے۔ اگر وہ یہ سوال کر بیٹھے کہ حضور جب میرا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ ایک نہیں تو میں کس طرح یہ گواہی دیدوں کہ وہ ایک ہے تو یہ جواب سُن کر یہ کہتی ہوئی اسلام کی تلوار گرے گی اور اس کا سر قلم کر دے گی کہ راستی پسند کہیں کا۔ جھوٹ نہیں بولتا۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ خدا ایک ہے اور اس میں بھی قطعاً کوئی شک نہیں کہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے بندے اور اُسکے رسُولؐ ہیں مگر جب رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین نے یہی سچّی گواہی دی تو محض اس لئے کہ اُن کے دل یہ گواہی نہیں دیتے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

قرآن کریم میں سورۃ منافقون کی پہلی آیت میں اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالےٰ یوں فرماتا ہے :-

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ

جب تیرے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو خدا کا رسُول ہے مگر باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ، جانتا ہے کہ تُو اُس کا رسُول ہے اللہ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق یقیناً جھوٹ بولتے ہیں۔

پس خدا تعالےٰ تو چاہتا ہے کہ منافق یہ جھوٹ بولنا چھوڑ دیں

مگر مولانا مودودی اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ صداقت کے نام پر بزور شمشیر لوگوں کو جھوٹ بولنے کی تلقین کی جائے۔ مَیں چونکہ اس نظریہ کا قائل نہیں اس لئے مولانا کو مجبور نہیں کر سکتا کہ میری بات مان لیں۔ میرا مذہب تو سیدھا سادہ یہی ہے کہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔

ضمناً مَیں یہاں اس شبہ کا بھی ذکر کر دُوں کہ ہو سکتا ہے مولانا یہ فرمائیں کہ اس آیت میں جن منافقین کا ذکر ہے وہ تو سرے سے ایمان ہی نہیں لائے تھے اور مولانا جن لوگوں کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں وہ قسم صرف اُن منافقین کی ہے جو ایک دفعہ یہ جان بُوجھ کر کہ یہ راستہ آمد و رفت کے لئے کھُلا ہُوا نہیں پھر بھی اسلام لے آئے تو مَیں مولانا سے درخواست کروں گا کہ مندرجہ بالا آیتِ قرآنی سے ملی ہُوئی اگلی دو آیات پر بھی نظر ڈالیں تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے:-

اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ ۝ (المنافقون ع۱)

انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور (اس ذریعہ سے لوگوں کو) راہِ خدا سے روک رہے ہیں یقیناً بہت ہی بُرا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ

(پہلے تو) وہ ایمان لائے پھر کافر ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں
اُن کے دلوں پر مُہر لگا دی گئی۔ پس وہ سمجھتے نہیں۔"

اِن ہر دو آیات کے مضمون سے یہ یقینی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ:۔

اوّل:۔ یہ منافقین جن کا ذکر کیا گیا ہے مُرتد تھے۔ پہلے ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے۔

دوم:۔ اُن کا یہ فعل کہ باوجود اس امر کے کہ یہ اسلام سے پھر گئے تھے پھر بھی گواہی دیتے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خُدا کے رسُول ہیں۔ خدا تعالےٰ نے سخت ناپسند فرمایا۔ ان کو "جھوٹا" کہا اور فرمایا کہ "بہت ہی بُرا ہے جو وہ کرتے ہیں۔"

سوم:۔ خدا تعالیٰ نے اِن کی اس منافقانہ گواہی کو اسلام کے لئے مفید نہیں بلکہ سخت نقصان دِہ قرار دیا اور فرمایا کہ اس طریق سے یہ لوگوں کو راہِ خدا سے روک رہے ہیں۔

لیکن مودُودی صاحب کا عقیدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے جھوٹے ہیں۔ بہت بُرا کرتے ہیں۔ مودُودی صاحب کا اصرار ہے کہ ایسا ہی کرو۔ دل سے بے شک نہ مانو مگر مُنہ سے یہی گواہی دیتے رہو کہ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خُدا تعالےٰ کے رسُول ہیں۔ ورنہ گردن مار دیئے جاؤ گے۔ چنانچہ راستی پسندی کا طعنہ دیتے ہُوئے ایسے مرتدسے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

"اگر وہ ایسا ہی راستی پسند ہے کہ منافق بن کر رہنا
نہیں چاہتا بلکہ جس چیز پر اب ایمان لایا ہے اس کی پیروی
میں صادق ہونا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سزائے موت
کے لئے کیوں پیش نہیں کرتا؟"[1]

یہ راستی پسندی کا طعنہ دے کر منافقت کی تلقین کرنا بھی
مولانا کا شاہکار ہے۔

پس خدا تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ جھوٹو منافق نہ بنو اور مولانا کا
ارشاد ہے راستباز آئے کہیں کے، منافق بن کر جان کیوں نہیں بچاتے؟
اور خدا تو فرماتا ہے کہ اس قسم کی منافقت لوگوں کو راہِ خدا سے روکتی
ہے (اور اسلام کے لئے سخت نقصان دِہ ہے) مگر مولانا کا اصرار ہے۔
کہ اگر ایسے مرتدین کو سچ بولنے کی اجازت دے دی جائے تو اسلام قائم
ہی نہیں رہ سکتا۔ اس طرح تو کوئی اجتماعی نظام کبھی دُنیا میں چل نہیں سکتا۔

کیا اس اختلاف کے بارہ میں کسی رائے زنی کی ضرورت رہتی ہے؟

مَیں نے اس باب کے شروع میں یہ بحث اُٹھائی تھی کہ آنحضرت
صلے اللہ علیہ وسلّم ہرگز "قتلِ مرتد" کے غیر فطری اور غیر منصفانہ نظریہ کے
قائل نہ تھے۔ اور اس امر کا اظہار کیا تھا کہ قرآنِ کریم اس بارہ میں آپؐ
کے اُسوہ پر غیر مشکوک روشنی ڈالتا ہے۔ پس آیئے اب ہم اس مسئلہ
پر قرآنِ کریم سے فیصلہ طلب کریں۔ کیونکہ قرآنی فیصلہ سے بہتر اور یقینی

---

[1] "مُرتد کی سزا" صفحہ ۵۳ ۞

اور کوئی فیصلہ نہیں۔

سُورۃ "المنافقون" (جس کی چند آیات اُوپر نقل کی گئی ہیں) ہی دراصل وہ سُورۃ ہے جس کی طرف مَیں نے اشارہ کیا تھا۔ یہ سُورۃ قتلِ مُرتد کے مسئلہ کو بحیثیت مسئلہ ہی واضح نہیں کرتی بلکہ اس بارہ میں رسُول اللہ صلّے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اُسْوَۃ کو بھی پیش کرتی ہے اور مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ہر شک رفع کرتی ہے۔ اس سُورۃ میں یقینی طور پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو ایسے مُرتدین کی خبر دی گئی تھی جو منافق بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی گواہی دیتے تھے۔ مگر خدا نے اُن کے سارے پول کھول دیئے۔ مگر باوجود اس کے اُن کے قتل کے بارہ میں نہ تو خدا تعالےٰ کی طرف سے کوئی حکم نازل ہُوا، نہ آنحضرتؐ نے خود اُن کو اِس جُرم میں قتل کروایا۔ ممکن ہے مولانا یہ شُبہ پیدا کریں۔ کہ اللہ تعالےٰ یہ فرما کر "منافقین جھُوٹے ہیں" دوسری آیت کو اس طرح شروع فرماتا ہے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً ".... انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔ یہ ڈھال دراصل ارتداد کی سزا یعنی قتل سے بچنے کے لئے تھی اور وہ مسلمانوں کو دھوکہ اس لئے دے رہے تھے کہ کہیں ہمارے ارتداد کا علم ہوگیا تو ہمیں قتل ہی نہ کردیں بظاہر تو یہ ایک راہِ فرار نکل آئی ہے مگر مولانا ذرا کچھ آگے چل کر تو دیکھیں اس سُورۃ نے ایسی ناکہ بندی کر رکھی ہے کہ واہمہ تک کو گذرنے کی مجال نہیں۔ چنانچہ انہی مُرتدین کا ذکر جاری رکھتے ہوئے کچھ آگے چل کر

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ○

"اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسولِ خدا تمہارے لئے (خدا سے) بخشش مانگیں گے تو سر مٹکانے لگتے ہیں اور تکبّر کرتے ہُوئے مُنہ پھیر لیتے ہیں"

اس آیت کے ہوتے ہوئے اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً سے یہ مراد لینی کہ وہ قسمیں اس خوف سے کھاتے تھے کہ قتل نہ کر دیئے جائیں ایسی صریح زیادتی ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا زیادتی ہوگی اس آیت سے جو واضح غیر مبہم نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں کہ :-

(۱) اُن مُرتدین کے لئے کسی قسم کے خوف کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا بلکہ جب اُنہیں کہا جاتا تھا کہ آؤ توبہ کرلو تو سر مٹکاتے تھے، مُنہ پھیر لیتے تھے اور سخت تکبّر سے پیش آتے تھے۔ کیا موت سے ڈرا ہؤا انسان یہ مظاہرہ کیا کرتا ہے ؟ اگر انہوں نے کسی خوف کی وجہ سے یہ جھُوٹ بولا ہوتا تو پھر تو یہاں یہ ہونا چاہیئے تھا کہ یہ سُنکر ڈر کے مارے اُن کے حواس خطا ہونے لگتے ہیں اور پھر وہ بڑے زور سے قسمیں کھاتے ہیں کہ استغفر اللہ واللہ باللہ تاللہ ہم تو مومن ہیں اور اگر تم نہیں مانتے تو ہم اب توبہ کر لیتے ہیں۔

(۲) یہ لوگ کوئی غیر معروف لوگ نہیں تھے بلکہ مسلمان جانتے تھے کہ یہ مرتدین کون ہیں تبھی تو جا کر اُن کو نصیحت کرتے تھے کہ توبہ کر لو۔ اور اگر بفرضِ محال پہلے نامعلوم بھی تھے تو اب اس سُورۃ کے نزول کے بعد بہر حال معلوم ہو چکے تھے۔

(۳) خدا تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ آؤ توبہ کرو ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے بلکہ یہ فرمایا کہ آؤ (میرا) رسُول تمہارے لئے بخشش مانگے گا اگر ارتداد کی سزا قتل تھی تو کیا یہ آیت اسی طرح ہونی چاہیئے تھی؟

مگر اب تو ارتداد پر طرّہ یہ کہ اُن مرتدین کی طرف سے سخت گستاخی بھی سرزد ہونے لگی۔ مسلمانوں کی کُھلی کُھلی تحقیر کرنے لگے سر مٹکانے لگے۔ مُنہ پھیرنے لگے۔ تکبّر کرنے لگے۔ یہاں پہنچ کر ایک متشدد ضرور یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ اب اگلی آیت میں اُن کے قتل کا حکم آجائے گا۔ بلکہ شاید عذاب دے کر مارے جانے کی تلقین ہو۔ مگر افسوس کہ اُن کے لئے ایک اور مایوسی کا مُنہ دیکھنا باقی ہے۔ کیونکہ نہ تو اگلی آیت میں۔ نہ اس سے اگلی آیت میں۔ نہ اُس سے اگلی آیت میں۔ حتیٰ کہ بقیہ ساری سُورۃ ہی میں کہیں اُن کے قتل کا حُکم نہیں ملتا۔

قتل کا حکم تو ایک طرف رہا ابھی تو انہیں اور ڈھیل دی جا رہی ہے اور آگے چل کر اللہ تعالیٰ اُن سے متعلق فرماتا ہے کہ وُہ مرتد صرف مسلمانوں کی ہی تحقیر نہیں کرتے بلکہ ظالم سیّدِ وُلدِ آدم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی بھی سخت تحقیر کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

کہتے ہیں جُوں ہی ہم مدینہ واپس پہنچے معزز ترین شخص (یعنی بدبخت منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول) (نعوذ باللہ) ذلیل ترین انسان کو مدینہ سے نکال دے گا۔ حالانکہ عزّت خدا ہی کی ہے۔ اور اُس کے رسُول کی اور مومنوں کی۔ مگر منافقین نہیں جانتے "

اس آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک غزوہ کے موقع پر جس میں بعض مُرتد منافقین بھی مسلمانوں کے ساتھ لشکر کشی میں شریک تھے۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے اپنی محفل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے متعلق مندرجہ بالا ناپاک الفاظ استعمال کئے۔ اُس بدبخت کا مطلب یہ تھا کہ مدینہ واپس جاکر وہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلّم اور آپؐ کے ساتھیوں کو مدینہ سے نکال دے گا۔ یہ بات جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم تک پہنچی اور آپؐ نے تحقیق فرمائی تو یہ لوگ جھوٹ بول گئے اور کہا کہ آنحضرتؐ نے ایک نوعمر لڑکے کی گواہی پر اعتبار کر لیا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعہ سُورۃ المنافقون میں یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر واضح فرما دیا اور اُس گواہی کی تصدیق فرمائی۔

یہ ایک ایسا جُرم تھا کہ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہر محبت رکھنے والے کو شدید غیرت آجاتی ہے اور دل کھولنے لگتا ہے۔ اور طبعًا انسان یہ سوچتا ہے کہ کم از کم اس بدبخت کو تو ضرور کوئی سزا دیجائیگی کیونکہ اس کا جُرم صرف جُرمِ ارتداد ہی نہیں رہا بلکہ یہ ذلیل ترین مُرتد دنیا کے معزز ترین رسُولؐ کے خلاف انتہائی گستاخی کا مرتکب ہُوا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ یہ کلمات اس نے ایک فوج کشی کے دَوران میں کہے جو قوموں کی زندگی پر ایک ہنگامی دَور ہُوا کرتا ہے۔ اور ایسے وقت میں سپہ سالار کے خلاف ایسے الفاظ صریح غدّاری کے مترادف سمجھے جاتے ہیں جس کی سزا موت ہے۔ خصُوصًا ایک مخصُوص پارٹی میں بیٹھ کر ایسی بات کرنا تو اور بھی زیادہ بھیانک جُرم بن جاتا ہے اور ایک سازش کا پتہ دیتا ہے۔ مگر کیا اس موقعہ پر ایک رنج اور غصّہ سے بھرے ہوئے دل کو یہ پڑھ کر سخت حیرت نہیں ہوتی کہ کوئی ایسی سزا نہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمائی گئی نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے خود تجویز فرمائی۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی جناب مودُودی صاحب یہ تأویل بھی نہیں کر سکتے کہ اُس وقت کمزوری کا دَور تھا اور اس شخص کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ کیونکہ یہ دَور تو خود مولانا کے الفاظ میں وہ دَور تھا:۔

”جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے تلوار ہاتھ میں لی۔ . . . تو رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ

چھوٹنے لگا۔ طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔"

چنانچہ یہ اُسی "تنوار" کے دَور کی بات ہے جبکہ" بدی و شرارت" کا زنگ چھوٹ" رہا تھا اور" طبیعتوں سے فاسد مادے نکل" رہے تھے۔

مگر قطع نظر مولانا کی اس رائے کے تاریخی شواہد بتا رہے ہیں کہ اس بات کے وہم تک کی گنجائش نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نعوذ باللہ اس کے خوف کی وجہ سے اُسے معاف فرما دیا۔ اوّل تو ایسے خیال کو دل میں جگہ دینا ہی اُس مقدّس رسُولؐ کی سخت گستاخی ہے۔ دوسرے اس بدبخت کی طاقت کی قلعی تو اسی امر سے کھُل جاتی ہے کہ اس کا اپنا بیٹا اپنے باپ کو چھوڑ کر رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں کی خاک کا غلام بنا ہُوا تھا اور اس کی فدائیت کا یہ عالم تھا کہ جب اُس نے اپنے باپ سے متعلق یہ شرمناک بات سُنی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبّت نے اس کے دل میں ایک عجیب ہیجان پیدا کر دیا اور محبُوب کی ہتک ہوتے دیکھ کر غیرت ایسی بھڑکی کہ خود آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسُولؐ اللہ اگر آپؐ نے میرے بدبخت باپ کے قتل ہی کا فیصلہ فرمایا ہے تو مجھے حکم دیجئے کہ مَیں خود اُسے اپنے ہاتھ سے قتل کروں۔ لیکن اس بیٹے کی پیشکش کو بھی اس رحمِ مجسّم نے ٹھکرا دیا۔ اور کیسی رحمتِ بے پایاں تھی کہ دُنیا کے معزّز ترین انسان نے ایک ننگِ انسانیت ذلیل ترین مرتد کو بھی معاف فرما دیا اور پھر اس کے بعد بھی ایک عجیب واقعہ ہُوا جس کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جس معصوم کے خلاف وہ جُرم کیا گیا تھا اس نے تو معاف فرما دیا۔ مگر مُجرم کا بیٹا اُسے معاف نہ کر سکا۔ اور جب مدینہ کی حدود میں وہ قافلہ داخل ہو رہا تھا اور قریب تھا کہ عبداللہ بن اُبَیّ بھی داخل ہو تو یہ بیٹا جس کا سینہ ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہتک کے خیال سے غصہ سے کھول رہا تھا آگے بڑھا اور اپنے باپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی تلوار نیام سے نکال لی اور کہا کہ خدا کی قسم مَیں آج تیرا سر قلم کردُوں گا اور مدینہ کی گلیوں میں گھسنے نہ دُوں گا۔ جبتک تو یہاں اعلان نہ کرے کہ میں دُنیا کا ذلیل ترین انسان ہوں۔ اور محمد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم معزز ترین انسان ہیں۔

اپنے بیٹے کے چہرہ پر ایک نظر ڈالتے ہی وہ سمجھ گیا کہ یہ جو کچھ کہتا ہے سچ کر دکھائے گا۔ پس اس کی نظریں جھک گئیں اور اپنے کئے پر معذرت پیش کرنے لگا۔ اس پر بھی شاید اُسے نجات نہ ملتی۔ مگر جانتے ہیں کہ اس کی نجات کو کون آیا؟ ــــ وہی سب محبُوبوں کا محبُوب رسُولؐ اور وہی سب درگذر کرنے والے انسانوں سے زیادہ درگذر کرنیوالا وہ جو ابراھیمؑ کی دُعاؤں کا ثمرہ تھا اور جس کے ظہور کی موسیٰؑ نے بھی خبر دی تھی۔ ہاں وہی دلوں کو بے اختیار موہ لینے والا جس کی محبّت کے داؤدؑ گیت گاتا رہا۔ وہی رحمتِ مجسّم اس مجرم باپ کو اس کے بیٹے کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے آگے آیا۔ آپؐ کی اُونٹنی جب قریب پہنچی اور آپؐ نے یہ ماجرا دیکھا تو فوراً اُونٹنی کو آگے

بڑھا کر اس کے بیٹے کو منع فرمایا اور راستہ چھوڑنے کی تلقین فرمائی
یہ تھا آپؐ کا سلوک ایک ایسے مُرتد کے ساتھ جو سب مُرتدین کا سردار تھا۔ جس کے ارتداد کی خود خدا نے گواہی دی اور جو اپنی زبان سے اپنی انتہائی ذلّت پر ہمیشہ کے لئے مُہر لگا گیا ـــ لیکن جُرم ارتداد کی سزا قتل قرار دینے والوں کو مَیں بتاتا ہوں کہ میرے محبُوب آقا کا کرم یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے اَور بھی اعلیٰ اور ارفع مقام آتے ہیں۔

یہ وقت گذر گیا اور نہ اس وقت نہ اس کے بعد کسی نے اُس مرتدوں کے سردار یا اُس کے ساتھیوں کے خلاف تلوار اُٹھائی یہانتک کہ اس نے طبعی موت سے اپنے بستر پر جان دی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے ہمیشہ ہمیش کے لئے اپنے سلوک سے یہ ثابت فرما دیا کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل نہیں اور یہ گواہی قرآن کریم میں ابد الآباد تک لکھی گئی۔ آپؐ کا یہ سلوک ایسے مرتدین کے ساتھ تھا۔ جن کے ارتداد کے بارہ میں کوئی شائبہ بھی باقی نہیں رہا تھا کیونکہ یہ ارتداد کا فتوٰی کسی انسان نے نہیں لگایا تھا بلکہ خود اس عالم الغیب خدا نے لگایا تھا جو دلوں کے ہر راز سے واقف ہے اور سب گواہوں سے زیادہ سچّا گواہ ہے۔ صرف یہی نہیں کہ آپؐ نے اس دنیا میں اُسے ارتداد کی کوئی سزا نہیں دی بلکہ رحمت کی حد یہ ہے کہ اس کی موت پر آپؐ کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ کہیں وہ آخرت کے

عذاب میں مبتلا نہ ہو جائے۔ حیرت ہے کہ آپؐ کا دل اسی کینہ ور کے لئے بے چین ہو گیا جو ہمیشہ آپؐ سے دشمنی کرتا رہا۔ جس کا سینہ آپؐ کی ترقی کو دیکھ کر بغض اور عناد سے بھر جاتا تھا اور جس کا دل آپؐ کے حسد میں ہمیشہ جلتا رہا۔ آپؐ اس کی موت پر اس ارادہ سے اس کے جنازہ کے لئے نکلے کہ اپنے خدا کے حضور گریۂ وزاری کر کے اور اس کے غیر محدود رحم اور عفو کا واسطہ دے کر اپنے اس بدبخت دشمن کے لئے بخشش کے طالب ہوں گے۔ آپؐ کے اس مقدس ارادہ کا اس طرح پتہ چلتا ہے کہ جب آپؐ جنازہ کے لئے نکلے تو حضرت عمرؓ نے جنازہ نہ پڑھنے کا مشورہ عرض کیا۔ لیکن جب آپؐ کو مُصر پایا۔ تو وہ آیتِ قرآنی پیش کی جس میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (سورۃ توبہ) کہ اگر تُو اُن کے لئے یعنی منافقوں کے لئے ستّر مرتبہ بھی معافی مانگے تو اللہ تعالےٰ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ اس پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا وہ ایسا پیارا ہے کہ جان آپؐ پر نچھاور ہونے لگتی ہے اور رُوح قدم بوسی کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ عمر! خدا تعالیٰ نے ستّر مرتبہ فرمایا ہے۔ میں ستّر سے زیادہ مرتبہ بخشش مانگ لُوں گا۔

پس اے میرے آقاؐ پر جبر و تشدّد کا الزام لگانے والو! آؤ تم کہاں ہو۔ آؤ کہ میں تمہیں اس لاثانی دل کے ساتھ متعارف کرواؤں جس کا رحم ابراہیمؑ کے رحم سے بڑھ کر تھا اور جس کی بخشش کے سامنے مسیحؑ

کی بخشش ایک واہمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ جو زمین کے ذلیل ترین کیڑوں کے ہاتھوں بھی ستایا گیا۔ اور جس نے ظالم ترین سفاکوں کو بھی معاف کر دیا۔ آؤ اور اس کریم فطرت کا نظارہ کرو۔ اور اس حلیم دل کو دیکھو۔ کہ جس کا صبر صبرِ ایوبؑ کو شرماتا تھا۔ ہاں وُہی حسنِ کامل کا مظہرِ تام جو اپنے ہر خلق میں ہر دوسرے نبی سے افضل تھا۔ اس کے نور سے دمکتے ہوئے چہرہ کی طرف نگاہ کرو۔ اور بتاؤ کہ کیا یہ وہی ہے جس کی تصویر تم نے اپنے تاریک قلموں سے کھینچ رکھی ہے؟ کیا یہ وہی ہے جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قرآن ہے؟

کاش تمہاری نگاہیں شرم سے جھک جائیں اور ندامت سے تمہاری آنکھیں خوننابہ ٹپکانے لگیں۔

مگر تمہارے دل پارہ نہیں ہوتے!!!

تشدد کے کچھ اور شاخسانے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کی جو تصویر مولانا مودودی نے کھینچ رکھی ہے اُسے دیکھ کر ایک تھوڑی سی سمجھ رکھنے والا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ تصویر ہر غیر مسلم کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ مودودی صاحب کے اسلام کا تصور سودا کے اس جملہ میں سمٹ آتا ہے کہ :۔

لانا بے غنچے میرا قلمدان۔"

سودا ایک ہجو گو شاعر تھے اور جب کسی مخالف سے اپنی مرضی منوانا مقصود ہوتی تو سُننے میں آیا ہے کہ دھمکی کے طور پر یہ فقرہ کہا کرتے تھے۔

مولانا کے اسلامی تصور کا ٹیپ کا مصرعہ بھی کچھ اسی قسم کا بنتا

ہے کہ :۔

"لانا ہے غنچے مہری تلوار"

پس ابھی اُن کی تلوار کی دھمکی ختم نہیں ہوئی اور ابھی تشدّد کے کچھ اور شاخسانے باقی ہیں :۔

ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

جب تشدّد کا چکر ایک مرتبہ چل پڑا تو تشدّد کے سوا اُسے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اب "سنگِ گراں" راہ میں یہ آیا ہے کہ اس بھیانک تصوّر کو پیش کرنے کے بعد تبلیغ کے تو سارے دروازے بند ہو گئے ہیں "چوہے دان" میں تو "چوہا" اس وقت پھنسا کرتا ہے جب اُسے متنبّہ نہ کیا گیا ہو۔ مگر یہاں تو وہ متنبّہ کر دیا گیا ہے۔ اور پیدائشی مسلمانوں کا حال بھی وہ دیکھ چکا عبادات کی قواعد بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں رہی۔ مذہب کے نام پر خونریزی ہوتی بھی اس نے دیکھ لی۔ اور بغاوت کی تمام تعلیم سے بھی واقف ہو گیا۔ پھر وہ کیا ایسا ہی سر پھرا "چوہا" ہے کہ ضرور "چوہے دان" کے اندر آئے گا ؟

"این" بیشہ مبر گماں کہ خالی ست
"باید" کہ پلنگ خفتہ باشد

ہمسایہ کا حق

مگر یہ سنگِ گراں بظاہر کیسا ہی کوہِ گراں کیوں نہ نظر آئے مودودی صاحب کی پُر تشدّد پالیسی کے

سامنے یہ سب رنگین ہیچ ہیں اور خاکِ راہ کی طرح اُڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ غیروں کے لئے آپ ایک تین نکاتی پروگرام تجویز فرماتے ہیں۔ اس کا پہلا جُزء حقوقِ ہمسائیگی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور دوسرے لفظوں میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چُوہا اگر ہمارے پاس نہیں آسکتا تو ہم تو چوہے کے پاس جا سکتے ہیں۔

آپ ہمسایہ کافر ملکوں پر حملہ کرنے کی ایک وجہِ جواز پیش فرماتے ہیں جو آپ ہی کے الفاظ میں سننے کے لائق ہے :۔

"اسلام یہ انقلاب ایک ایک مُلک یا چند مُلکوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً مسلم پارٹی کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہوں وہاں کے نظامِ حکومت میں انقلاب پیدا کریں۔ لیکن ان کی آخری منزلِ مقصود ایک عالمگیر انقلاب کے سوا کچھ نہیں۵"

یہاں مجھے بھی مولانا سے اتفاق ہے کہ اسلام کی آخری منزلِ مقصود ایک عالمگیر انقلاب کے سوا کچھ نہیں۔ مگر اختلاف یہ ہے کہ انقلاب سے مولانا کی مراد بعینہٖ وہی ہے جو اشتراکی انقلاب سے ہے۔ حتیٰ کہ نعرہ بھی وہی ہے۔ مگر میرے نزدیک اسلام کی آخری منزلِ مقصود ایک رُوحانی عالمگیر انقلاب رُونما کرنا ہے۔

---

۵ "حقیقتِ جہاد" صـ ۶۳ ؎

مولانا کا اسلامی انقلاب قدم بقدم اشتراکیت کی ڈگر پر چل رہا ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی ایک جگہ گذارش کی تھی اگر آپ مسلم پارٹی کی بجائے کمیونسٹ پارٹی پڑھنا شروع کر دیں تو مجال ہے کہ کوئی اشتراکی سمجھ سکے کہ لینن کی آواز ہے کہ مودودی صاحب کی۔ اشتراکی انقلاب کی بنیاد بھی **ذات** پر مبنی نہیں عدل پر ہے۔ اور مودودی صاحب کا انقلاب بھی اسی مرکزی تصور کے گرد بلکہ اسی کے بہانے گھومتا ہے اور حد یہ ہے کہ وجہِ جواز بھی دونوں کی ایک ہی سی ہے اور ہمسایہ کے حقوق کا تصور بھی بعینہٖ ایک ہے۔ دیکھئے مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

انسانی تعلقات و روابط کچھ ایسی ہمہ گیری اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کوئی ایک مملکت بھی اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمسایہ ملک میں بھی وہی اصول و مسلک رائج نہ ہو۔ لہٰذا مسلم پارٹی کے لئے اصلاحِ عمومی اور تحفظِ خودی دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطّہ میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے پر اکتفاء نہ کرے[1]"

آپ نے یہ ہمسایہ ملکوں کے حقوق کے بارہ میں مودودی صاحب کا "اسلامی تصور" ملاحظہ فرما لیا۔ کیا اس میں اور اشتراکی تصوّر میں کوئی فرق ہے؟

---

[1] "حقیقت جہاد" صـ

اب آگے چلیئے کہ یہ مقصد حاصل کس طریق پر ہوگا تو وہ طریق یہ نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو یہ مسلم پارٹی تمام ممالک کے باشندوں کو یہ دعوت دے گی کہ " اس مسلک کو قبول کریں جس میں اُن کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہو گی تو وہ لڑکر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی "۔

تشدّد اور گھٹیا بزدلی کا جو امتزاج اس آخری فقرہ میں پایا جاتا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہے "۔ اگر اس میں طاقت ہو گی تو وہ لڑکر . . . " یا دوسرے لفظوں میں جہاں کوئی کمزور دیکھا اُسے مار کوٹ کر منوالے گی اور جہاں طاقتور نظر آیا وہ دعوت نامہ نکال کر پیش کر دے گی۔ کمزور مظلوم سے متعلق جس پر حملہ کیا جارہا ہو تو اس پالیسی کا تصوّر قابلِ برداشت ہے کیونکہ اس کے اختیار ہی میں نہیں ہے کہ وہ اس حملہ کو روک سکے۔ وہ اگر اپنے آپ کو کمزور پاکر اس ڈر سے کہ مجھے لڑائی میں اور بھی زیادہ مار نہ پڑ جائے چُپ سادھ جائے تو انسان اُسے معذوری کا نام دے سکتا ہے مگر ایک حملہ آور کی یہ پالیسی کہ ایک جیب میں چُھرا ہو اور دوسرے میں دعوتی کارڈ، اس کے لئے جو نام میرے ذہن میں آتا ہے وہ اگر میں نے لکھ دیا تو مولانا ضرور ناراض ہوں گے اور سخت ناراض ہوں گے۔ مگر وہ بھی بے چارے مجبور ہیں اگر عقائد بگاڑ دیئے گئے ہوں اور دلائل اور اخلاقِ حسنہ اور قربانی اور دُعا اور نصیحت اور صبر کے تمام ہتھیاروں کے ٹکڑے اُڑ چکے ہوں تو اسلام تو بہر حال کسی طرح پھیلانا ہی ہے نا۔!

اللہ تعالیٰ نے بھی مختلف قسم کے جانور پیدا فرمائے ہیں۔ بعض پرندے ہوتے ہیں جن کے پاس صرف پیار کے گیت ہوتے ہیں اور معصوم حُسن کی بے آواز دعوتیں۔ اور بعض درندے ہوتے ہیں جن کے پاس وحشتناک حملوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ امتزاج شاذونادر ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہاتھ میں تلوار ہو اور ایک میں دعوتی کارڈ۔

مجھے یاد ہے کہ ہائی کورٹ کے سامنے لارڈ لارنس کا ایک بُت تھا جس کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں قلم۔ یعنی قلم کی حکومت مانو ورنہ تلوار کی سزا پاؤ گے۔ مگر فرق یہ ہے کہ اس کا تعلق محض اُن لوگوں سے تھا جو پہلے ہی سے بزور تلوار اس کے محکوم بنائے جا چکے تھے اور قلم بھی اُن ہی لوگوں کے لئے تھا جن کے لئے تلوار تھی۔ مگر ایسا عجوبۂ روزگار بُت ابھی بننے کو ہے جس کے ایک ہاتھ میں ایک برہنہ چمکتی ہوئی تلوار ہو جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا دعوتی کارڈ بھی لٹکا ہوا ہو اور دوسرے ہاتھ میں محض ایک خوشنما مرقع دعوتی کارڈ ایک چاندی کی طشتری میں سجایا ہوا ہو۔ تلوار والا ہاتھ تو ایک نحیف و زار، نیم مُردہ، نیم زندہ مفلوک الحال شخص کی طرف اُٹھا ہوا ہو اور طشتری والا ہاتھ دوسری سمت میں ایک دیوہیکل، تنومند، گرانڈیل جوان کی خدمتِ عالیہ میں وہ چاندی کی طشتری پیش کر رہا ہو۔

لیکن اس طشتری میں ایک چھوٹا سا کارڈ اگر اس مضمون کا بھی لکھ کر رکھ دیا جائے کہ حضور ابھی ہم کمزور ہیں جب طاقتور ہوں گے تو پھر

حاضرِ خدمت ہوں گے۔ تو اس بارہ میں کیا خیال ہے ؟

لیکن اگر کہیں اندازہ میں غلطی ہو گئی اور انقلابی نظر نے دھوکا کھایا کسی طاقتور پر تلوار اُٹھ گئی تو پھر ؟ ــــ

بہرحال موُدودی صاحب کی اشاعتِ اسلام کا تصوّر یہ ہے اور وُہ اس بارہ میں خود مختار ہیں۔ پابند تو ہم لوگ ہیں جنھیں کچھ بولنے کی اجازت نہیں۔ اور اس تصوّر کا خلاصہ سیدھے سادے الفاظ میں یہی ہے کہ چونکہ تم ہمارے ہمسایہ ہو اور ہمارا فرض ہے کہ ہر طرح سے تمہاری بہبُود کا انتظام کریں اور بہرحال تمہیں ہلاکت سے بچائیں۔ اس لئے ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اگر تمھیں اپنے سے کمزور پائیں تو آنکھیں بند کر کے ہڑپ کر جائیں۔

دُوسرے دُو نکات

اس تبلیغی پروگرام کے دُوسرے دُو نکات احتیاطی تدابیر کے طور پر ہیں۔ پہلے کا تعلق غیر مسلموں کے اس حق سے ہے کہ وہ مسلمانوں کو تبلیغ کر سکیں۔ اس کا جواب تو واضح ہی ہے :-

اس مسئلہ کا فیصلہ تو بڑی حد تک قتلِ مُرتد کے قانون نے خود ہی کر دیا ہے (یعنی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ناقل)، کیونکہ جب ہم اپنے حدودِ اقتدار میں کسی ایسے شخص کو جو مسلمان ہو اسلام سے نکل کر کوئی دُوسرا مذہب و مسلک قبول کرنے کا حق نہیں دیتے تو لامحالہ اس کے معنی یہی ہیں کہ ہم حدودِ دارالاسلام میں اِسلام

کے بالمقابل کسی دوسری دعوت کو اُٹھنے اور پھیلنے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔[۱]

دلیل بڑی واضح ہے اور قارئین سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ مختصراً اپنے الفاظ میں بھی بیان کر دیتا ہوں۔ جب مودودی صاحب کے اسلام نے اپنے لئے مندرجہ ذیل حقوق محفوظ کروا لئے ہوں:-

(۱) تبلیغی دعوت بھجوانا۔

(۲) کوئی قبول کرے نہ کرے جس کسی پر اختیار چلے حملہ کر دینا اور بزور حکومت چھین لینا۔

(۳) اگر اپنوں میں سے کوئی شخص دوسرا مذہب قبول کرے۔ تو اُسے قتل کر دینا۔

تو پھر ظاہر ہے کہ دوسرے مذہب کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی یہی تین طریق اختیار کرلے۔ وہ کوئی سچا ہے جو اُسے یہ حقوق پہنچتے ہوں مودودی صاحب تو سچے ہیں۔

کافروں کو کافروں میں تبلیغ کرنے کی ممانعت

آخری نکتہ جو مولوی صاحب اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں پیش فرماتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اگر بعض کافروں نے کافروں ہی میں تبلیغ شروع کر دی تو ممکن ہے بعض کافر دوسرے کافروں کو قائل کر کے اُن کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیں۔ اس لئے

---

[۱] "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" صـ۳۲ ۛ

اُن کافروں کو یہ حق کہاں سے مل گیا کہ کافروں میں تبلیغ کریں۔ یہ الفاظ میرے ہیں دلیل مودُودی صاحب کی ہے۔ اب مودُودی صاحب کے الفاظ میں بھی اِس دلیل کو سُن لیجیئے:۔

"اب ظاہر ہے کہ جب اسلام کا اصل موقف یہ ہے تو اس کے لئے اس بات کو پسند کرنا تو درکنار گوارا کرنا بھی سخت مشکل ہے کہ بنی آدم کے اندر وہ دعوتیں پھیلیں جو ان کو ابدی تباہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔ وہ داعیانِ باطل کو اس بات کا کھُلا لائسنس نہیں دے سکتا کہ وہ جس آگ کی طرف خود جارہے ہیں۔ اس کی طرف دوسروں کو بھی کھینچیں[1]"

مودُودی صاحب کے الفاظ بھی آپ نے ملاحظہ فرمالیئے۔ اب مَیں اس پر مزید کیا کہوں ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو مَیں
مقدُور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو مَیں

یہاں سوال یہ نہیں تھا کہ کافروں کو مسلمانوں میں تبلیغ کی اجازت ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ تھا کہ کافروں کو کافروں میں تبلیغ کی اجازت ہے یا نہیں۔ مگر مودُودی صاحب کے نزدیک "اسلام" داعیانِ باطلہ کو اس امر کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ دلیل کچھ اس طرح پر قائم کی گئی ہے کہ یہ

[1] "مُرتد کی سزا" صـ۳۵

کس طرح اجازت دی جاسکتی ہے کہ جس کفر کی آگ میں وہ خود پڑے ہوئے ہوں اس کی طرف دوسروں کو بھی کھینچیں۔ حالانکہ صورتِ حال یہ بنتی ہے کہ جس آگ میں ایک قسم کے کافر پڑے ہوئے ہیں اُسی آگ میں دوسری قسم کے کافر بھی پڑے ہوئے ہیں۔ اور جہاں تک اُن کے آگ میں ہونے کا تعلق ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لئے مودودی صاحب کی دلیل دراصل یہ بنے گی کہ اسلام یہ بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ ایک وسیع آگ میں جلنے والے کفّار اُس آگ کی دوسری سمت سے لوگوں کو اپنی طرف بلائیں۔ اگر اس بات کی اجازت دے دی جائے تو بیچارے اس آواز پر لبیک کہنے والے جل جائیں گے۔ اور اسلام یہ ظلم کس طرح برداشت کرسکتا ہے؟

پس بنی نوعِ انسان کی گہری ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ اوّل تو کچھ پچکار کر کچھ ڈرا دھمکا کر لوگوں کو اس آگ کے ٹکڑے سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اگر کوئی نہ مانے تو کم از کم یہ ضرور کیا جائے کہ لڑ کر بزورِ شمشیر اس خطۂ نار پر اقتدار حاصل کر لیا جائے اور پھر جب اقتدار حاصل ہو جائے تو تلوار تانے ہوئے سنتری اُن جلتے ہوئے کفّار پر نگران کھڑے ہو جائیں اور ایک آواز دینے والا یہ آواز دے کہ ——— "خبردار تم میں سے کوئی دوسرے کو اپنی طرف نہ بلائے ورنہ گردن مار دی جائے گی۔ اس طریق پر تو تم سارے لوگ جل جاؤ گے اور یہ سوچ کر بھی ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس لئے جس کروٹ پر جہاں جل رہے

ہو وہیں اُسی کروٹ پر جلتے رہو ورنہ مار مار کر ہم ٹکڑے اڑا دیں گے۔ شرم نہیں آتی ہمیں دُکھ دیتے ہوئے؟ ظالم کہیں کے!"

یہ آواز سُن کر پھر کس کی مجال ہے کہ دم مارے اور جگہ تبدیل کرے؟ لیکن اگر اس حبسِ دوام سے سخت گھبرا کر اور عواقب سے بے خوف ہو کر کوئی "جلنے والا" یہ سوال کر بیٹھے کہ" اے شاہِ اقتدار! آپ نے ہم سے تمام آزادیاں چھین لیں اور پابہ زنجیر کر دیا۔ محض اسلئے کہ کسی طرح ہمیں آگ کے اِس خطّے سے نکالیں جسے ہم آگ کا خطّہ نہیں سمجھتے اور اس سوزش کے عذاب سے بچالیں جس کی جلن کو ہم محسوس نہیں کرتے۔ اے شاہِ بقتدار! ہم اُس آگ کو تو آگ نہیں سمجھتے مگر یہ تلوار کے زور سے ہمارے ہاتھوں سے حکومتیں چھین کر اور آزادیوں کو سلب کر کے جو آگ آپ نے ہمارے سینوں میں بھڑکائی ہے وہ ہمیں جلا کر خاکستر کئے دیتی ہے اس کے بدلہ میں ہم نے کیا پایا؟ ...... کیا ہم ابھی تک اسی طرح اُسی "خطّۂ نار" میں موجود نہیں جس سے آپ ہمیں نکالنا چاہتے تھے؟ پس اب آپ یہاں کھڑے نظّارہ کیا کر رہے ہیں۔ آگے بڑھیئے اور اگر آپ کی ہمدردی کے دعوے سچّے ہیں تو یا تو ہمیں اس خطّۂ نار سے نکال لیجئے جو آپ کے نزدیک خطّۂ نار ہے تاکہ ہمیں آزادی کے سانس نصیب ہوں یا پھر اس آگ ہی کو ٹھنڈا کر دیجئے جو خود آپ نے ہمارے سینوں میں بھڑکائی ہے۔"

یہ دردناک پکار سُن کر وہ آواز دینے والا یہ جواب دے گا۔ کہ

ان دونوں کیفیتوں میں سے ایک کو بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔

زیادہ سے زیادہ بادلِ ناخواستہ وہ جس چیز کو گوارا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص خود کفر پر قائم رہنا چاہتا ہو اُسے اختیار ہے کہ اپنی فلاح کے راستہ کو چھوڑ کر اپنی بربادی کے راستہ پر چلتا رہے اور یہ بھی وہ صرف اس لئے گوارا کرتا ہے کہ زبردستی کسی کے اندر ایمان اُتار دینا قانونِ فطرت کے تحت ممکن نہیں[1]۔

یہ جواب سُن کر جو کچھ اس سوالی کے دل پر بیتے گی اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہر صاحبِ دل انسان کر سکتا ہے کیا وہ اس آتش زار کی دیواروں سے سر نہ ٹپکے گا کہ جب یہ بزرگ جانتے تھے کہ" زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دینا قانونِ فطرت کے تحت ممکن نہیں"۔ تو پھر یہ اب تک مجھ سے کیا سلوک فرماتے رہے ہیں؟

لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اُس کافر کو اپنے آتش زار کی دیواروں سے سر پٹکنے دیجئے۔ اور اک ذرا وہ بھی سُن لیجئے۔ جو یہ جواب سُن کر میرے دل پر گذری غالبؔ کے اس مصرعہ کے مصداق کہ

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب

واقعی دل مختلف قسم کے جذبات کے ہیجان سے ایک طلسمِ پیچ و تاب

---

[1] "مرتد کی سزا" صفحہ ۳۵۔

بن رہا ہے اور حیرت ہے اور غصہ ہے اور غم ہے اور سخت تلملاہٹ ہے کہ آخر کیوں وہ غیر فطری افعال جن کے کرنے کی حتیٰ کہ خود مودودی صاحب کو جرأت نہ ہو سکی آپ نے اس جرأت اور دھڑلّے کے ساتھ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کئے ہیں؟

خود تو اپنے تصوّر کی دُنیا میں۔ اُس دنیا میں جہاں تشدّد کی بادشاہی تھی اور تلواریں گر رہی تھیں اور گردنیں کاٹی جارہی تھیں۔ جب اس مقام تک پہنچے جو اس جدّوجہد کا آخری مقام تھا اور وہ قلعہ جب سامنے آیا۔ جس کا سر کیا جانا ہی مقصود تھا تو ہاتھ لرز گئے اور قدم ڈگمگا گئے، اور اس سراسر غیر فطری فعل کے دعوی کی بھی جرأت نہ کرسکے اُس وقت اُنہیں اپنی فطرت کی یہ آواز سُنائی دی کہ

"زبردستی کسی کے اندر ایمان اتار دینا قانونِ فطرت کے تحت ممکن نہیں"

مَیں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ فطرت کی آواز کیوں گنگ تھی جب وہ میرے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ ناپاک الزام لگا رہے تھے۔ کیوں نہ اُنھیں اس وقت یہ آواز سُنائی دی جب ان کا قلم یہ زہر اُگل رہا تھا کہ:۔

"قوم نے آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کردیا لیکن جب وعظ وتلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی . تو رفتہ رفتہ بدی و

شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اگر وہ اس دعوئی میں سچے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تلوار کی طاقت سے دلوں کے زنگ کو دور کیا تھا تو پھر یہ جھوٹ ہے کہ "زبردستی کسی کے اندر ایمان اُتار دینا قانونِ فطرت کے تحت ممکن نہیں" اور اگر یہ سچ ہے اور یہی سچ ہے تو پھر وہ جھوٹ تھا کہ میرے آقا نے تلوار کی دھار سے قلوب کے زنگ کو کھرچا تھا۔ مگر ظلم کی حد یہ ہے کہ اپنے لئے تو پیمانہ فطرت ہے اور آقا کے اخلاق کو ہر غیر فطری پیمانے سے ناپا جا رہا ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگا بیٹھے تھے تو کم از کم اخلاق اور وفا کا تقاضا یہ تھا کہ پھر خود بھی اُسی الزام کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ دیتے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عشق کا تو یہ حال تھا کہ ہر اُس وار کو جو اُن کے محبوب آقا پر کیا جاتا تھا اپنے ہاتھوں پر اپنے دلوں پر لیتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جنگِ حُنین کے موقعہ پہ حضرت طلحہؓ کا ہاتھ اُن تیروں کو روک روک کر جو رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھینکے گئے تھے ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گیا تھا۔ مگر مولانا کا یہ حال ہے کہ تیر روکنے کا تو کیا سوال۔ آنحضرتؐ کے شدید ترین دشمنوں کی ہمنوائی میں آپؐ پر مہلک اعتراضوں کے تیر برسا رہے ہیں

اور جب وہی تیر خود ان کی طرف پھینکے جاتے ہیں تو دامن بچا کر الگ جا کھڑے ہوتے ہیں۔ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ۝ یہ تو بہت ہی بُری تقسیم ہے!

قتلِ مُرتد ظلم نہیں رحم ہے

یہ بہت ہی بُری تقسیم ہے۔ مگر تقسیمات تو بانٹنے والے پر منحصر ہُوا کرتی ہیں اور بانٹنے والے کی طرزِ فکر اپنے فکر کی ہر تخلیق پر اپنی مُہرثبت کرتی چلی جاتی ہے۔ جس طرح ایک صانع یا ایک مصوّر یا ایک شاعر اپنی صنعت یا تصویر یا شعر سے پہچانا جاتا ہے اور جس طرح وہ صنعتیں یا تصاویر یا اشعار مختلف حالات اور کیفیات کا نتیجہ ہونے کے باوجود ایک خاص رنگ اپنے بنانے والے کا اپنے اندر رکھتی ہیں اسی طرح مودودی صاحب کی بھی ہر تخلیق پر اُن کا ایک خاص رنگ غالب ہے اور یہ رنگ سُرخ ہے ہر دیکھنے والا اس رنگ کو سُرخ ہی دیکھتا ہے اور یہی وہ رنگ ہے جس میں مودودی آنکھ اسلام کو رنگین دیکھنے کی عادی بن چکی ہے مگر خدا جانے کیوں اسے فطرت کی آواز کہہ لیجئے یا نظارہ کرنے والی آنکھوں کا لحاظ۔ کبھی کبھی مولانا اس رنگ کا نام سبز رکھ دیتے ہیں اور ناظرین کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ جسے تم سُرخ دیکھ رہے ہو۔ دراصل یہ سبز ہے۔

قتلِ مُرتد کے بارہ میں مولانا کے تصوّرات سے تو قارئین روشناس ہو ہی چکے ہیں اور انکے اس عقیدہ پر بھی ابھی اطلاع پا چکے ہیں کہ زبردستی کسی کو مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ اس مؤخر الذکر عقیدہ کا

لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب زبردستی مسلمان بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ تو پھر اس سلسلہ میں زبردستی کرنی بھی خلافِ عقل اور ممنوع ہوگی مگر مولانا اس نتیجہ کو تسلیم کرنے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے اور اپنی مخصوص طرزِ استدلال کے ذریعہ اپنے اُوپر یہ ثابت کر لیتے ہیں کہ ایمان کی اشاعت کے لئے ہر قسم کا جبر جائز ہے اور اگر اشاعت کے لئے نہیں تو اسی عذر پر یہ جبر جائز ہے کہ مومنوں کا ایمان محفوظ رہے۔ چنانچہ اس خود حفاظتی کے بہانے ہمسایہ ملکوں پر حملہ کرنا بھی نہ صرف جائز بلکہ بس چلے تو از بس ضروری ہے۔ ہاں ایک مقام پر جا کر یہ اس عقلی تقاضا کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور وہ مقام قتلِ کافر کا مقام ہے اور خود مولانا کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ایمان نہ لانے کے جرم میں کافر کو قتل نہیں کیا جا سکتا لیکن آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ ہے ایک عقلی اعتراض سے تو بچ نکلے۔ دوسرا آ پڑا۔ مشکل اب یہ درپیش ہے کہ جرمِ کفر میں اگر ایک کافر کو قتل کی سزا نہیں دی جا سکتی تو پھر مُرتد کو اسی جُرم کی سزا میں کیوں مارا جا رہا ہے۔ کیا اُسے زبردستی مسلمان بنایا جا سکتا ہے؟ اگر صرف یہ کہا جائے کہ ایسے شخص کا سوسائٹی میں رہنا سوسائٹی کے لئے نقصان دِہ ہے تو جواباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح دوسرے کفّار کا سوسائٹی میں رہنا سوسائٹی پر بُرے رنگ میں اثر انداز نہیں ہوتا اسی طرح اس نئے کافر کا حال ہوگا اور اگر وہاں بھی برداشت ہوتا ہے تو یہاں بھی برداشت کر لیں۔ جو پابندیاں آپ دوسرے کفّار پر عائد کرتے ہیں اِس نَو کافر پر

بھی عائد کر دیجئے۔ زیادہ سے زیادہ گھر بدر بلکہ مُلک بدر کر دیجئے۔ عُمر قید کی سزا دے دیجئے۔ یہ قتل کا بھلا کیا جواز ہُوا۔ یہ تو صریح نا انصافی اور ظلم ہے۔ تو یہ جواب سُن کر مولانا ہمیں خبر دیتے ہیں کہ نادانو! آنکھ کے اندھو! یہ ظلم نہیں یہ تو رحم ہے۔ دکھائی نہیں دیتا تو پوچھ ہی لیا کرو اپنے الفاظ میں اس رحم کی تفصیل مولانا یُوں فرماتے ہیں:۔

"اُس کے لئے دو ہی علاج ممکن ہیں۔ یا تو اُسے اسٹیٹ میں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کرکے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلی صُورت فی الواقع دوسری صُورت سے شدید تر سزا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی کی حالت میں مبتلا رہے...... اس لئے بہتر یہ ہے کہ اُس کو موت کی سزا دے کر اس کی اور سوسائٹی کی مصیبت کا بیک وقت خاتمہ کر دیا جائے[۱]۔"

کیا یہ بعینہٖ اُس سُرخ پوش کی آواز کی سی آواز نہیں ہے۔ جو مجمع میں کھڑا حاضرین کو یہ یقین دلا رہا ہو کہ اندھو۔ نابیناؤ۔ مان لو کہ میرے کپڑوں کا رنگ سبز ہے"۔

لیکن اگر رنگ واقعی سبز ہے اور ہم نے غلطی کھائی ہے تو مولانا کو میرا مشورہ یہی ہے کہ ذرا دھیمی آواز میں بات کریں۔ اگر اُس آتش زار

---

[۱] "مُرتد کی سزا" صفحہ ۵۱

کے بسنے والے کفّار کے کانوں تک یہ آواز جا پہنچی جن کا ابھی کچھ دیر پہلے تذکرہ گذرا ہے تو کیا انہیں اس خیال سے دھکا نہیں لگے گا کہ "دعوے تو یہ تھے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے تمہاری ہی ہمدردی اور بہبود کی خاطر ہے مگر جب قسمتوں کی تقسیم کا وقت آیا تو رحم تو اپنوں کی جھولی میں ڈال دیا اور ظلم ہمارے دامن میں۔ حالانکہ جرم دونوں کا ایک ہی نوعیت کا تھا" وہ کفّار مولانا سے متعلق کیا کیا نہ خیال دل میں لائیں گے اور کیسے کیسے ظنّ اُن پر نہ کریں گے؟ اس لئے بہتر ہے کہ یہ اپنی آواز کو دھیما کریں اور کیوں نہ بس اسی امر پر اکتفاء ہو جائے کہ قتل سے کچھ دیر پہلے صرف مُرتدین کے کانوں میں سرگوشی کر دی جائے کہ میاں غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا فی الواقعہ تم سستے چھُوٹے ہو اور تم سے استثنائی طور پر رحم کا سلوک کیا گیا ہے اور جاتے جاتے مزید ہمدردی کے اظہار کے طور پر اُن کا ہاتھ بھی دبا دیا جائے اور رازداری کے رنگ میں نظریں ملا کر مسکراتے ہُوئے، اور اگر حسنِ اتفاق سے کوئی کافر وہاں موجود ہو تو اس کی طرف سر کا اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی بڑھا دیئے جائیں کہ دیکھتے نہیں ان لوگوں کا کیا حال ہے؟ لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی۔ نہ تو یہ مرتا ہے نہ زندہ رہتا ہے۔

مگر موُدودی صاحب یہ ہمدردانہ سلوک تجویز فرماتے ہوُئے غالباً ایک بات بھُول گئے کہ اسلام کے نزدیک موت فی ذاتہٖ انجام نہیں ہے بلکہ اس کے بعد پھر ایک زندگی ہو گی جس کا نام اسلام حیاتِ آخرت

رکھتا ہے اس لئے دراصل یہ اُس مُرتد کی مصیبت کا خاتمہ نہیں فرما رہے
ہوں گے بلکہ اسے سیدھا جہنّم داخل کر رہے ہوں گے۔ اُن کی اس دُنیا
کی امکانی زندگی سے متعلق (جس سے مولانا اس مصیبت زدہ کو نجات دلا
رہے ہیں) تو یہ ایک انسانی رائے تھی کہ وہ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی
والی حالت کے مصداق ہے مگر جہاں اسے اب بھجوا رہے ہیں اُس سے
متعلق تو خود خدا فرماتا ہے کہ "لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی" نہ تو وہ بدبخت
اس میں مرے گا نہ زندہ رہے گا۔ صرف اِسی پر بات ختم نہیں ہو جاتی بلکہ
موازنہ اس سے بھی بدتر ہے۔ مولانا اُسے جس آگ سے نجات دینے
کے لئے ازراہِ شفقت مار رہے تھے وہ خود اُن کے ہاتھوں کی بھڑکائی
ہوئی تھی اور زیادہ سے زیادہ ہم اُسے نارِ صغریٰ کہہ سکتے ہیں یعنی چھوٹی آگ
مگر اب جس آگ کی طرف اسے بھجوا رہے ہیں اُس کا نام خود خدا تعالیٰ نے
"اَلنَّارُ الْکُبْرٰی" رکھا ہے یعنی بڑی آگ۔ پس مولانا کا یہ مصیبتوں سے
نجات دلانے کا عجیب طریق ہے کہ ایک لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی کی
حالت سے نکال کر دوسری شدید تر لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی کی حالت
میں دھکیل رہے ہیں اور ایک ہلکی آگ سے نجات دے کر دُوسری بڑی
آگ میں جھونک رہے ہیں اور ابھی یہ خاص رحمت اور نرمی کا سلوک
ہے اور یہ اعلان بھی جا رہی ہے کہ یہ رنگ سُرخ نہیں ہے سبز ہے۔

کافر کو تو پھر کچھ امید ہو سکتی تھی کیونکہ ابھی اُس نے اپنی طبعی موت
تک خدا جانے کتنے برس دیکھ بھال کے کاٹنے تھے اور خدا جانے کتنے مواقع

اُسے میسر آنے تھے کہ حق و باطل میں تمیز کر کے اُخروی نجات کو پالینا مگر یہ مجبور مُرتد کہ جس کی رگِ جان کے ساتھ ہی نجات کی سب امیدیں منقطع کر دی گئیں دوسری دُنیا میں آنکھ کھولتے ہی جب جہنم کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا تو خدا جانے اُن ہاتھ دبانے والوں سے متعلق کیا سوچ رہا ہوگا جنھوں نے قتل سے پہلے اسے یہ یقین دلایا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی فلاح اور بہبودی کی خاطر کیا جا رہا ہے۔

آخر میں مَیں پھر قارئین کی یاد تازہ کرنے کی غرض سے اشاعتِ اسلام کے بارہ میں مودودی صاحب کی پالیسی کے تمام نکات کو مختصراً بیان کر دیتا ہوں :-

(۱) غیر اسلامی ممالک کو دعوتی کارڈ بھجوائے جائیں مگر طاقت پاتے ہی خصوصاً ہمسایہ ممالک پر حملہ کر دیا جائے۔

(۲) کافروں کو مسلمانوں میں تبلیغ سے منع کر دیا جائے۔

(۳) کافروں کو کافروں میں تبلیغ سے منع کر دیا جائے۔

اس کے علاوہ میرے نزدیک لازماً قتلِ مُرتد کا مسئلہ بھی اسی پالیسی کا جزو ہے اور دراصل یہ چار نکاتی پروگرام کہلانا چاہیئے تھا مگر مشکل یہ ہے کہ مولانا کو مجھ سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک یہ اس پالیسی کا حصّہ اس لئے ہے کہ طبعاً قتل کے خوف سے بہت سے مسلمان دوسرے مذاہب اختیار کرنے سے رُک جائیں گے۔ مثلاً پچھلے دنوں پاکستان میں ایک خاصی تعداد میں مسلمانوں نے عیسائیت اختیار کی۔ اگر یہ طریقِ قتل

رائج ہوتا تو شاید مشکل سے اُن مرتدین میں سے ایک آدھ ہی ایسا انسان نکلتا کہ ”منافق بن کر زندہ رہنا“ پسند نہ کرتا۔ مگر مولانا کے نزدیک یہ اس پالیسی کا حصّہ نہیں ہے اور اس کا مقصد یہ نہیں کہ اس طرح مسلمانوں میں منافق پیدا کیے جائیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

قتلِ مُرتد کو یہ معنی پہنانا بھی غلط ہے کہ ہم ایک شخص کو موت کا خوف دلا کر منافقانہ رویّہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دراصل معاملہ برعکس ہے۔ ہم ایسے لوگوں کے لئے اپنی جماعت کے اندر آنے کا دروازہ بند کر دینا چاہتے ہیں۔ جو تلوّن کے مرض میں مبتلا ہیں اور نظریات کی تبدیلی کا کھیل تفریح کے طور پر کھیلتے رہتے ہیں....

..... لہٰذا یہ عین حکمت و دانش ہے کہ ہر اُس شخص کو جو اس جماعت کے اندر آنا چاہے پہلے ہی مطّلع کر دیا جائے کہ یہاں سے پلٹ کر جانے کی سزا موت ہے تاکہ وہ داخل ہونے سے پہلے سو مرتبہ سوچ لے کہ اُسے ایسی جماعت میں داخل ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اس طرح جماعت میں آئیگا ہی وہ جسے کبھی باہر جانا نہ ہوگا۔[1]

مجھے یاد ہے قیامِ پاکستان سے پہلے ہندوستان کی اشتراکی پارٹی کا بھی بعینہٖ یہی طریق تھا۔ وہ اپنی خفیہ سوسائیٹیوں کا ممبر بنانے

---

[1] ”مُرتد کی سزا“ صفحہ ۵۱-۵۲ ؎

سے پہلے ہر آنے والے کو یہ تنبیہہ کر دیا کرتے تھے کہ میاں! باہر جانے کی سزا موت ہوگی ـــــ زراعتی کالج لائل پور کا ایک طالب علم جسے مَیں جانتا تھا بیچارہ اسی جرم میں مارا گیا تھا ـــــ مگر یہ تو ضمناً مجھے ایک بات یاد آگئی تھی جو مَیں نے کردی کیونکہ اس سے میرے اس نظریہ کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ مودودیت میں اشتراکیت کا رنگ غالب ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ مولانا نے کچّی عمر میں لینن یا مارکس کے بعض اُردو ترجمے پڑھ لئے ہوں، اور آئندہ زندگی کے تصوّرات ڈھالنے میں انہوں نے ضرورت سے زیادہ کام کیا ہو مگر اس ذکر کو مَیں چھوڑتا ہوں۔ اس وقت اصل مبحث یہ نہیں تھا۔

مَیں مولانا مودودی کی قتلِ مُرتد کی وہ توجیہہ لکھ رہا تھا جسے سننے کے بعد پھر میرا یہ حق نہیں رہتا کہ قتلِ مرتد کے عقیدہ کو بھی اشاعت اسلام کی پالیسی کا ایک جُزو بناؤں۔ چنانچہ مَیں نے ایسا نہیں کیا اور محض تین نکاتی پروگرام پیش کیا ہے۔ پس اب اس حصۂ مضمون کو ختم کرتا ہوں مگر جانے سے پہلے مودودی صاحب مجھے اجازت دیں۔ کہ اُن کی پیش کردہ مندرجہ بالا توجیہہ سے متعلق ایک دو سوال پیش کردوں وہ سوال یہ ہیں کہ:۔

اوّل:۔ اگر آپ کا یہ دعویٰ درست ہے کہ قتلِ مُرتد کا اصل مقصد یہی ہے کہ آپ "ایسے لوگوں کے لئے اپنی جماعت کے اندر آنیکا راستہ بند کر دینا چاہتے ہیں" تو یہ فرمائیں کہ عام انسانی پیدائش کے

طریق پر اِس مزاج کے جو مسلمان آپ کی سوسائٹی کے اندر مسلسل داخل ہوتے رہیں گے اُن کی روک تھام کے لیئے آپ نے کیا تجویز سوچی ہے اور

دوم:۔ اگر "عین حکمت و دانش" یہی ہے کہ "ہر اُس شخص کو جو جماعت کے اندر آنا چاہے پہلے ہی مطلع کر دیا جائے کہ یہاں سے پلٹ کر جانے کی سزا موت ہے۔" تو وُہ کون سے ذرائع ہیں جن کو اختیار کر کے پیدائش سے پہلے ہی مسلمانوں کو خبردار کر دیا جائے گا کہ اگر آنا ہے تو سَو مرتبہ سوچ کر آؤ۔"

• لازم تھا کہ خلافِ فطرت عقائد کی توجیہات بھی خلافِ فطرت ہی ہوں ۔

مودودی دورِ حکومت کی ایک امکانی جھلک

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا!

گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے قارئین پر وہ تصوّر خوب واضح ہو چکا ہوگا جو مولانا مودودی اسلام، اسلام کے رسولؐ، اسلام کی اشاعت اور اسلام کے اقتدار کے بارہ میں رکھتے ہیں۔ اب میں ان صفحات میں اُس امکانی مودودی حکومت کا ایک مختصر سا خاکہ کھینچ کر دکھاتا ہوں جو مودودی صاحب کے حصولِ اقتدار کے بعد کسی اسلامی یا غیر اسلامی ملک کے پردہ پر رونما ہوگی۔ میرے غیر اسلامی کہنے پر تعجب نہ کریں کیونکہ حقیقۃً یہ بعید

نہیں کہ پہلے کسی اسلامی مُلک میں ظہور پذیر ہونے کی بجائے یہ انقلاب کسی غیر مسلم اکثریت کے مُلک میں ظاہر ہو جائے کیونکہ جب "ہر مسلم پارٹی" اپنے اپنے مُلک میں یہ مزعومہ "اسلامی انقلاب" لانے کی کوشش میں مصروف ہوگی اور حصولِ اقتدار کا ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا جا رہا ہوگا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کہاں یہ انقلاب پہلے آئے گا؟ سعودی عرب میں یا غانا میں؛ مصر میں یا لبنان میں؛ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟

بہرحال جب بھی، جس طرح بھی اور جہاں بھی یہ اسلامی حکومت رونما ہوگی اس کے کچھ مخصوص نقوش ہونگے جن پر اس وجود کے طرزِ فکر کی نہ مٹنے والی مُہر ثبت ہوگی جس کے ذہن نے اس کا تصوّر قائم کیا۔ اور جس کی کوششیں تصوّرات کے عالَم سے اُسے عالمِ وجُود میں لے آئیں سب سے پہلا عملی قدم جو حصولِ اقتدار کے بعد اُٹھایا جائے گا وہ غالباً یہ ہوگا کہ اسلام کے عنوان کے تحت مودُودی عقائد کی ایک فہرست شائع کی جائے گی اور یہ اعلانِ عام کیا جائے گا کہ کسی معیّن مدّت کے اندر اندر وہ تمام مسلمان جو اِن عقائد کے قائل ہیں نزدیک ترین تھانوں یا عدالتوں میں اپنے نام درج کروا دیں۔ اگر وقتِ مقرّرہ کے اندر کوئی مسلمان رجسٹر ہونے سے رہ گیا تو اپنی جان، مال اور عزّت کا وُہ خود ذمہ دار ہوگا نیز اس عرصہ کے اندر اندر تمام رعایا اپنے ہتھیار جمع کروا دے۔

اس اعلان کے بعد حکومت فوری طور پر قتل و غارت کی تیاری میں مصروف ہو جائے گی اور مودُودی فوج اور مودُودی پولیس اپنے

ہتھیاروں کو صیقل کرلے گی اور ایک ایسے جہاد کے لئے کمرِ ہمت کسنے لگے گی جس میں محنت اور مشقت تو بہت ہوگی مگر شہادت کا کوئی خطرہ نہ ہوگا کیونکہ اس معیّن دن سے پہلے پہلے دشمن کو نہتّہ کیا جا چکا ہوگا۔

ایک بے چین عرصۂ انتظار کے بعد آخر وہ دن آجائے گا۔ جبکہ کروڑوں ایسے مُرتدین کی گردنیں مودُودی تلواروں کے نیچے حلال کردی جائیں گی جو مرتدین پہلے پیدائشی مسلمان کہلاتے تھے۔ چنانچہ ایک آواز دینے والے کی آواز پر خدا جانے کتنی تلواریں اُٹھیں گی اور گرینگی اور کتنے سرتن سے جُدا ہوں گے اور کتنے بدن خاک و خون میں غلطاں ہوں گے اِس اگر مولانا مودُودی کے اقوال اور افعال میں کوئی فرق نہیں اگر وہ وہی سب کچھ کر بھی سکتے ہیں جو وہ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا اور نہ جانے کتنی تلواریں ایک مرتبہ نہیں ہزار مرتبہ اُٹھیں گی اور ہزار مرتبہ گریں گی اور سرتن سے جُدا ہوتے رہیں گے اور بدن خاک و خون میں غلطاں ہوں گے۔

وہ وقت ایسا ہوگا کہ اگر خاوند نے توبہ کرلی یا راستی کی راہ سے ہٹ گیا تو خود اُسے تو زندہ رکھا جائے گا مگر اس کی بیوی اس کی آنکھوں کے سامنے تہِ تیغ کی جائے گی اور اگر بیوی نے توبہ کرلی یا جھوٹ بول کر منافقت کی راہ اختیار کی تو وہ خود زندہ رکھی جائے گی مگر اُس کا راستباز خاوند اس کی آنکھوں کے سامنے ہلاک کیا جائے گا۔ بچے بلا استثناء زندہ رکھے جائیں گے اور بہر حال اپنی ماں یا باپ یا ماں باپ کو مرتا ہُوا

دیکھیں گے اور ان دودھ پیتے بچّوں کے بلکنے سے جن کی بے قرار آنکھیں مُرتد ماؤں کو ترسیں گی اور ان یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی گریہ و زاری سے جن کی روتی ہوئی آنکھیں پھر کبھی ان مرتد باپوں کو نہ دیکھ سکیں گی۔

.... پاکستان کی بستی بستی، قریہ قریہ سے وہ نعرہ ہائے درد بلند ہوں گے کہ ان کی چیخ پکار کنگرۂ عرش کو ہلا دے گی اور ایک طرف تو چین کی دیواریں کانپیں گی اور دوسری طرف یورپ پر لرزہ طاری ہوگا۔ اور جب ان چند ایک صالحین کے بازو گرذبیں مارتے مارتے شل ہو جائینگے تو انہی مرتدین سے وسیع و عریض کھائیاں کھُدوا کر اُن میں سُرخ آگ بھڑکائی جائے گی اور رہے سہے مرتدین کو زندہ آگ میں جلا دیا جائے گا۔ اور اُس آگ کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی لپٹیں پاکستان کے شمال اور جنوب مشرق و مغرب کو روشن کر دیں گی۔ پس وہ کیسی مبارک صبح ہوگی جب اُفقِ پاکستان سے مودودیت کا یہ سُرخ سویرا طلوع ہوگا!

مگر یہ تو محض ایک ابتداء ہے اور انتہاء سے پہلے ابھی کئی ایک منازل طے کرنی باقی ہیں۔ اگر سب سے پہلا انقلابی مُلک پاکستان ہوُا تو ابھی تو کتنے ہی اسلامی ممالک کے وسیع و عریض خطّے پاکستان کے دائیں اور بائیں اور آگے اور پیچھے پھیلے پڑے ہیں جہاں "مرتد مائیں" "مرتد بچّے" جَن رہی ہیں اور ابھی تو ہندوستان کے "چھ کروڑ مرتدین" کا صفایا باقی ہے۔ ابھی باقی ہے وُہ نوحہ جو پہاڑوں کے سینے پھاڑ دے گا اور آسمان کے پردے چاک کر دے گا۔ اور وہ گریہ باقی ہے جسے سُن کر

زمین کی چھاتیوں کا دُودھ خشک ہو جائے گا اور آسمان کے ستارے سینہ کوبی کریں گے اور جس کے درد سے چاند سُورج کی آنکھیں بھی روتے روتے اندھی ہو جائیں گی!

پھر کیا اس وسیع قتل و غارت کے بعد جبکہ تمام اسلامی ممالک اکثر مسلمان آبادیوں سے خالی ہو چکیں گے ان ذی اقتدار حقیقی مسلمانوں کی پیاس بجھ جائے گی اور ہوسِ اقتدار کی آگ ٹھنڈی پڑ جائیگی؟ — اگر ان بلند عزائم کو دیکھا جائے جو مولانا کے دل میں جوش مارتے ہیں اور نوکِ زبان اور قلم سے جاری ہوتے رہتے ہیں تو اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ نہیں۔ ابھی یہ پیاس نہیں بجھے گی اور یہ آگ ٹھنڈی نہ ہو گی جب تک کہ کفار حکومتوں کو دعوتِ اسلام بھجوانے کے بعد اُن کے اصرارِ کفر پر یا اس کا انتظار کئے بغیر ہی بزورِ شمشیر مقہور نہ کر لیا جائے۔ ابھی تو ان کے غضب کی بجلی کو یورپ پر بھی گرنا ہے اور امریکہ پر بھی۔ چین پر بھی۔ اور جاپان پر بھی۔ آسٹریلیا پر بھی اور نیوزی لینڈ پر بھی۔ ابھی تو اس کے کوندوں نے افریقہ کے صحراؤں پر چمکنا ہے اور سیاہ جنگلوں کو آگ لگانی ہے۔ ابھی تو اُس نے رُوس کو نذرِ آتش کرنا ہے اور سائبیریا کی یخ بستہ ترائیوں کو شعلۂ ایمان بخشنا ہے۔ ابھی تو کتنے ہی قتل و غارت کے بازار گرم ہونا باقی ہیں! ابھی مودُودی تلواروں نے کتنے ہی اور گھاول کا سُرخ پانی پینا ہے۔ اور میں یہ سوچتا ہوں کہ جب یہ مودُودی اِسلام زمین کے چپہ چپہ کو لالہ رنگ کر چکے گا۔ تو ہزاروں ہزار میل کے ویرانوں

میں کسی "تنہا" "صالح مسلمان" کی صدائے اذان کیسی بھلی معلوم دے گی۔ اور میں سوچتا ہوں کہ مولانا کے امنِ عالم کا اسلامی تصوّر کتنا بھیانک ہے جس امن کی تصویر چپ چاپ خاموش قبرستانوں میں نظر آتی ہے، اور جس کا دوسرا نام زندگی کا فقدان ہے۔ موت ہے

منافقین کی ایک عالمگیر جماعت

اور اگر یہ قتل و غارت کا بازار گرم نہ ہوا تو صرف ایک صورت میں...... صرف ایک صورت میں کہ دُنیا کے پردہ پر منافقین کی ایک عظیم عالمگیر جماعت ظہور پذیر ہو ورنہ اس تلوار سے بچنے کا کوئی امکان نہیں۔ ناظرین اسے افسانہ یا شاعری خیال نہ کریں اگرچہ یہ درست ہے کہ جب مودُودی عزائم کا عمل کی دنیا میں نقشہ کھینچکر دیکھا جائے تو وہ ایک ہولناک افسانہ معلوم ہوتا ہے یا ایک خوفناک خواب یا ایک شاعر کا دل ہلا دینے والا تصوّر۔ مگر افسوس کہ نہ تو یہ خواب ہے نہ کوئی افسانہ، نہ شاعرانہ تصوّر بلکہ ایک جیتی جاگتی بظاہر سوچنے کی طاقت رکھنے والی علمِ دین و فہم رسالت رکھنے کی دعویدار ہستی کے وہ نظریات ہیں جو وہ آج اسلام کے نام پر دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے اور اس تحدّی کے ساتھ کہ جب بھی موقعہ ملا ان دعاوی پر عمل کر کے دکھایا جائے گا۔

یہ ہے وہ اسلام کے عالمگیر غلبہ کا دن جو مودُودی تصوّر کی کھڑکیوں سے جھانک رہا ہے۔ کیا نعوذ باللہ اسی دن کو کھینچ لانے کیلئے

آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے افقِ عرب سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے نیّرِ عالم تاب کا ظہور ہوا تھا؟

اے کاش مولانا مودودی اپنے مذہب کو اسلام کے سوا کوئی اور نام دے لیتے اور ہمارے آقاؐ کے نام کو اپنے اس کریہہ المنظر تاریک و تار تصوّر میں ملوث نہ کرتے لیکن اگر ایسا کرتے تو کون ان کی پیروی کرتا اور کون ان کو اس نئے مذہب کے نام پر ووٹ دیتا۔ اس لئے ان کے سامنے صرف ایک راہ باقی تھی اور وہ راہ یہی تھی کہ اپنے آمرانہ خیالات کو ہمارے معصوم آقاؐ کی طرف منسوب کرکے رائج کرتے۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا اور امن اور سلامتی کے اس رسول کے نام کو بھی اس کشت و خون کے میدان میں گھسیٹنے سے گریز نہیں کیا۔ جس رسول کا ایک ایک سانس امن کا پیغام لے کر آتا تھا۔ جس کے مذہب کا نام ہی اسلام تھا!

مَیں نے عمداً اس امکانی نقشہ کو کھینچتے ہوئے حتی الامکان اختصار اور احتیاط سے کام لیا ہے اور صرف انہی نقوش کی تصویر کشی کرنے پر اکتفاء کی ہے۔ جو واضح اور غیر مشکوک طور پر مولانا کی مختلف کتب میں ملتے ہیں اور جن کے اقتباسات گذشتہ صفحات میں قارئین کی خدمت میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ ویسے مودودیت کے مزاج کو سمجھ لینے کے بعد یہ کچھ مشکل نہیں رہتا کہ انسان ہر دائرہ حیات میں ایک امکانی مودودی حکومت کی صحیح صحیح تصویر اُتار سکے۔

مثلاً اس دور کے تمدنی حالات کا نقشہ کھینچا جا سکتا تھا یا ڈنڈے

کے زور سے عبادات کروانے پر جو مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے
اس کا ذکر کیا جا سکتا تھا اسی طرح اس حکومت کے بین الاقوامی تعلقات پر
بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا اور ان کوششوں کا تصوّر بھی باندھا جا سکتا تھا
جن کے ذریعہ ملک سے بد دیانتی، رشوت ستانی اور بد معاملگی کو دُور کرنے
کی کوشش کی جاتی۔ اسی طرح ملک کے سیاسی حالات کا نقشہ پیش کرنا بھی
کچھ مشکل نہ تھا۔ ایک ایسا ملک جس کی بنا ہی نظریۂ تشدّد اور خونریزی پر
ہو وہ بغاوتوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ اور اگر اس ملک میں منافقین کی
کثرت ہو تو پھر تو یہ خطرہ غیر متناسب طور پر بڑھ جاتا ہے۔ بلکہ جُوں جُوں
وقت گذرتا جائے۔ ایسی حکومت کے خلاف ردِّ عمل بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔
پس ان تمام امکانی خطرات کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا جو ایسی
حکومت کو یقیناً پیش آ سکتے ہیں اس کے علاوہ دوسری قسم کی سازشوں
کا تصور بھی باندھا جا سکتا تھا اور اس خفیہ نظام جاسوسی کا بھی اندازہ
لگایا جا سکتا تھا جس کے ذریعہ سے حکومت ان سازشوں اور بغاوتوں
کا پتہ لگاتی۔ اور عذاب دینے کے اُن ذرائع کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ
ہوتا جو ایسی حکومت نے مزید معلومات یا خالص صداقت معلوم کرنے کے
لئے بہر حال اختیار کرنے تھے مگر مَیں ان سب امور سے قطع نظر کرتا ہوں۔
اور قارئین کے انفرادی رجحان یا ذوق پر معاملہ چھوڑتا ہوں تاہم اگر کسی
دوست کو مزید تجسس ہو تو مؤخر الذکر امر کے بارہ میں واقعاتی نقشے اشتراکی
انقلاب کی تاریخ یا
History of The Priest-craft in

all ages" ہسٹری آف دی پریسٹ کریفٹ اِن آل ایجز" میں بکثرت مل سکتے ہیں جن کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

مہلت اور معافی نامہ کا ایک فرمانِ عام

آخر پر یہ باب ختم کرنے سے پہلے اگر میں اس عام مہلت اور معافی نامہ کا ذکر نہ کردوں جسے جاری کرنے کے امکان کا مودودی صاحب اظہار فرما چکے ہیں تو یہ اُن سے ناانصافی ہوگی جیسا کہ میں نے باب کی ابتداء میں ہی اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ میرا خیال ہے کہ مودودی حکومت اقتدار حاصل کرتے ہی ایک عام فرمان جاری کرے گی اور یہی دستور ہر انقلابی حکومت کا ہوا کرتا ہے۔ اور اس فرمان کے مطابق مسلمانوں کو بعض مخصوص عقائد مدنظر رکھتے ہوئے بحیثیت مسلمان رجسٹر ہونا پڑے گا۔ کم وبیش اسی مضمون کے فرمان جاری کرنے کے امکان کا اظہار مودودی صاحب نے اپنی کتاب "مرتد کی سزا ....." کے آخر پر فرمایا ہے۔ فرق یہ ہے کہ میرے نزدیک تو جو لوگ اس وقت مودودی اصطلاح کے مطابق "مسلمان" قرار نہیں دیئے جائیں گے وہ بہرحال تہ تیغ کئے جائیں گے۔ مگر مودودی صاحب نے اس امکان کا ذکر کیا ہے کہ چونکہ اس طرح ایک بے نظیر اور بے شمار قتلِ عام لازم آئے گا اس لئے ممکن ہے ان کو فی الفور قتل کرنے کی بجائے صرف امت سے خارج کرکے کافر ذمیوں کی طرح زندہ رہنے پر مجبور کرنے کو ہی کافی سمجھا جائے۔ لیکن اس کے بعد اگر بقیہ مسلمانوں میں سے کوئی مسلمان

اعتقاداً یا عملاً کافر ہو تو اُسے بہرحال قتل کیا جائے مگر مولانا کے اس شاہانہ معافی نامہ کے باوجود میں نے اپنے پیش کردہ نقشہ میں جو قتل عام کا مختصر سا خاکہ کھینچا ہے اس کی بعض وجوہ ہیں:-

۱- اوّل تو یہ کہ خود مولانا کی طرف سے بھی کسی یقینی معافی نامے کا اعلان نہیں۔ مشکل سے صرف ایک امکانی حل کا ذکر ہے اور مجھے یقین ہے کہ حصولِ اقتدار کے بعد اس "نرمی" کے سلوک کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا کیونکہ خود مولانا ہی کے الفاظ ہیں:-

"حکومت اور فرمانروائی جیسی کچھ بد بلا ہے ہر شخص اس کو جانتا ہے۔ اس کے حاصل ہونے کا خیال کرتے ہی انسان کے اندر لالچ کے طوفان اُٹھنے لگتے ہیں۔ خواہشاتِ نفسانی یہ چاہتی ہیں کہ زمین کے خزانے اور خلقِ خدا کی گردنیں اپنے ہاتھ میں آئیں تو دل کھول کر خدائی کی جائے[1]۔"

۲- دُوسری وجہ میرے اس یقین کی یہ ہے کہ اس معافی نامہ کو صادر فرمانے پر آمادگی میں مولانا سے ایک غلطی ہوگئی ہے جسے وہ جلد یا بدیر خود محسوس فرمالیں گے یا شاید ان کا ہمخیال اس طرف اُن کی توجہ مبذول کروا دے۔ غلطی یہ ہے کہ اگر اسلامی قانون میں مُرتد کی سزا قتل ہے اور وہ پیدائشی مسلمان بھی جو بڑے ہو کر اعتقاداً یا عملاً اسلام سے منحرف ہو چکے ہوں اس قانونِ

[1] "حقیقتِ جہاد" - ص۱۵

شریعت کی رُو سے واجب القتل ہیں تو مولانا کو یہ اختیار کہاں سے حاصل ہوگیا کہ وہ اِن مجرموں کو معاف کرتے پھریں۔ کیا وہ کوئی نئی شریعت بنائیں گے یا شریعت کے کسی حکم کو منسوخ یا تبدیل کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کوئی چارہ نہیں اس کے سوا کہ یا تو اس شریعت سے منحرف ہو کر خود مُرتدین کے زمرہ میں جا بیٹھیں یا پھر بادلِ ناخواستہ قتلِ عام کا حکم جاری فرمائیں خواہ کروڑوں کروڑ آدمی اس کی زد میں آئیں۔

۳۔ مولانا ایک اور بات بھی بھول گئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب خود مولانا کو یہ تسلیم ہے کہ اِن دو صورتوں میں سے کہ

"یا تو اسے اسٹیٹ میں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کر کے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلی صورت فی الواقع دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لَا یَمُوْتُ فِیْہَا وَلَا یَحْیٰی کی حالت میں مبتلا رہے[1]۔"

تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جب مولانا نرمی اور رحم کے مزاج میں ہوں تو دو صورتوں میں سے ایسی سزا تجویز فرمائیں جو فی الواقع دوسری صورت سے "شدید تر سزا" ہو۔

ان وجوہ کی بناء پر میں مجبور تھا کہ اپنے پیش کردہ نقشہ کو اسی طرح

---

[1] "مرتد کی سزا" ص ۵۱ ۔

پیش کروں جس طرح میں نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ مودودی حکومت کے ساتھ قتل و غارت کا تصور تشدد کی ایسی مضبوط آہنی زنجیروں سے جکڑا جا چکا ہے کہ خود ان زنجیروں کا خالق بھی اگر چاہے کہ انہیں کھول کر یا توڑ کر اس تصور کو الگ کر دے تو یہ اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں رہا۔ ع

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر!

اس معذرت کے بعد اب میں وہ الفاظ نقل کرتا ہوں جو خود مودودی صاحب کے الفاظ ہیں تاکہ اگر میں نے کسی نتیجہ تک پہنچنے میں غلطی کھائی ہو تو احباب خود درستی فرمالیں۔

"اگر آگے چل کر کسی وقت اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو۔ (خیال رہے کہ یہ مضمون ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا تھا۔ ناقل) اور قتلِ مرتد کا قانون نافذ کر کے ان سب لوگوں کو بزور اسلام کے دائرے میں مقید کر دیا گیا جو مسلمانوں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اسلام کے پیدائشی پیرو قرار دیئے جاتے ہیں تو اس صورت میں بلاشبہ یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کے نظامِ اجتماعی میں منافقین کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو جائے گی جس سے ہر وقت ہر غداری کا خطرہ رہے گا۔

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ لِلصَّوَاب کہ جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان

آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ

"جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد اُن سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی اُن پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اُسے قتل کر دیا جائے گا۔"

اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے گی کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عملِ تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں[1]۔"

اس اقتباس پر میرا بس اتنا سا تصرّف ہے کہ نوٹس والے حصہ کو

[1] مرتد کی سزا" صفحہ ۸۱ و ۸۰

تحریر سے پیوستہ لکھنے کی بجائے الگ پیرا بنا کر لکھا گیا ہے ورنہ مضمون اور الفاظ من و عن مودودی صاحب کے ہی ہیں۔ دیکھئے اس اصلاحِ خلق کے تصوّر میں کس قدر بچگانہ خوش فہمی پائی جاتی ہے۔ جیسے کوئی جنّوں پریوں کی دنیا میں بس رہا ہو۔ حکومت نہ ہوئی الہ دین کا چراغ ہو گیا اور اصلاحِ خلق نہ ہوئی برف کے محل کی تعمیر ہو گئی۔ لیکن اگر واقعی ایسا ہی ہے اور حکومت الہ دین کا چراغ ہی ہے اور اصلاحِ خلق برف ہی کا محل ہے۔ جس کی تعمیر اس چراغ کے جن کے لئے کچھ مشکل نہیں تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ اگر یہ چراغ کھو یا گیا؟ — مجھے اس وقت انبیائے گذشتہ کا بہت خیال آرہا ہے کتنے ہی ان میں سے ایسے تھے جن کی ساری زندگی سخت مظلومی کی حالت میں کٹی کاش ان کو بھیجتے وقت بھی خدا تعالیٰ یہ چراغ ان کے ہاتھوں میں تھما دیتا! کچھ ان کے دکھ دُور ہوتے کچھ دنیا کے دلدّر۔ تاریکیاں چھٹ جاتیں اور ہر طرف ہدایت کا نور بکھر جاتا۔

یہ اقتباس پڑھنے کے بعد میرا یہ قیاس اور بھی قوی ہو گیا ہے۔ کہ مودودی صاحب نے بچپن میں ضرور مارکس یا لینن کے اُردو ترجمے پڑھے ہیں اور روسی انقلاب کی تاریخ بھی دیکھی ہے جن سے اُن کی طبیعت میں بہت ولولے پیدا ہوئے ہیں اور نئے نئے خیال دل میں آئے ہیں کہ اچھا یوں بھی ہو سکتا ہے؟ گذشتہ مصلحین تو پھر یُونہی بھولے بھٹکے رہے۔ یہ نہ کسی سے ہُوا کہ ایک انقلابی پارٹی بنا لیتا جس کا نعرہ یہ ہوتا کہ ہم آئے تو اصلاح کرنے ہی ہیں مگر" یہ سمجھنے کے لئے زیادہ غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ

اصلاحِ خلق کی کوئی اسکیم بھی حکومت کے اختیارات پر قبضہ کئے بغیر نہیں چل سکتی۔"

"لہٰذا اس پارٹی کے لئے حکومت پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں[۱]۔"

چنانچہ ہم پہلے حکومت پر قبضہ کریں گے اس کے بعد تمہاری اصلاح کا کام شروع کریں گے اور تم دیکھو گے کہ حکومت ہاتھ آتے ہی ہم مار مار کر تمہارے دلوں کو کیسا صاف اور ستھرا کر دیتے ہیں۔ اس ذکر میں مجھے قرآنِ کریم اور مولانا کے درمیان ایک اور اختلاف یاد آگیا۔ قرآنِ کریم تو فرماتا ہے کہ جب اصلاح کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو پھر سختی کا وقت شروع ہوتا ہے۔ اور جب سختی کا وقت شروع ہو جاتا ہے تو پھر اصلاح کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ فرعون اٰمنت اٰمنت کہتا ڈوب گیا۔ مگر اس کا ایمان قبول نہ ہوا۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ قرآن کریم یوں بیان فرماتا ہے:۔

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُوْنَ ۝ (المؤمنون $\frac{9}{85}$)

لیکن جب وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے تو اُن کے ایمان نے اُنہیں کچھ بھی فائدہ نہ دیا۔ یہ خدا کی سُنت ہے جو اس کے بندوں کے بارہ میں چلی آتی ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں کافر گھاٹے میں پڑ گئے۔

---

[۱] "حقیقتِ جہاد" ص۵۹

مودودی نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے اور اس نظریہ کے مطابق ڈنڈا پہلے ہے اصلاح بعد میں ہے۔ بلکہ حقیقی ایمان تو نصیب ہی اُسوقت ہوتا ہے جب تلوار دلوں کے زنگ دُور کر دے۔

یہ بحث تو خیر یونہی ضمناً نکل آئی ذکر یہ ہو رہا تھا کہ مودودی صاحب کے یہ تصوّرات کہاں سے آتے ہیں۔ قرآنِ کریم سے اگر نہیں تو پھر کہیں سے تو آئے ہیں یا محض اپنی ہی ایجاد ہے؟ مشکل یہ ہے کہ ایجاد اسے ہم کہہ نہیں سکتے کیونکہ اس قسم کے اصلاحی تصوّرات پہلے ہی سے دنیا میں موجود ہیں۔ دیکھنا صرف یہ باقی تھا کہ کہاں موجود ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں جو کچھ مجھے معلوم تھا تحریر کر دیا۔

اب آخر پر مَیں اُس ردِّ عمل کو لیتا ہوں جو مولانا کے مندرجہ بالا مجوزہ انقلابی اعلان کو پڑھ کر مختلف طبائع پر ہو سکتا ہے ایک تاثر تو وہی ہے جس کا مَیں نے اُوپر ذکر کر دیا ہے یعنی انسان اسے زیادہ سے زیادہ ایک معمّر بزرگ کا بچپن سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ میں سوچتا ہوں کہ بفرضِ محال اگر واقعی کوئی ایسا انقلابی دن کسی بدقسمت مُلک نے دیکھا تو اس اعلان کو پڑھنے کے بعد لوگوں کا ردِّ عمل کیا ہوگا۔

میرا خیال ہے موٹی طبیعت کے اُجڈ قسم کے آدمی تو یہ اعلان پڑھ کر قاصد کے مُنہ پر ماریں گے کہ "جاؤ جاؤ بڑے آئے ہو اصلاح کرنے والے کہیں کے۔ خدائی فوجدار بنے پھرتے ہو۔ تمہیں کس نے ٹھیکہ دیا ہے میرے مذہب کا؟ گھر جا کر بیٹھو۔ اور اگر پھر اس طرف کا رُخ کیا تو۔۔۔۔۔"

یہ وہی طبقہ ہے جس سے متعلق غالب کہتا ہے کہ ؎

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاھد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں کے

یہ طبقہ میں سمجھتا ہوں کہ مزید مہلت دیئے بغیر اُسی وقت حکومت کے رجسٹروں میں "کافر" شمار کر لیا جائے گا۔

دوسرا ایک بڑا طبقہ میرے خیال میں ایسا ہوگا جو ایک سال سخت پریشانی کے عالم میں مبتلا رہنے کے بعد جُز بُز تو بہت ہوگا مگر آخرؔ "غیر مسلم" ہونے کا اعلان کر دے گا۔ یہ مؤخر الذکر طبقہ وہ ہے کہ جس کا پہلا ردِ عمل عام طور پر جان بچانے کے خیال کی صُورت میں ظاہر ہُوا کرتا ہے یہ وہی طبقہ ہے جس سے متعلق مودُودی صاحب کو یہ خوف ہے کہ اگر فوری طور پر مرتد کی سزا قتل قرار دے دی گئی تو یہ فوراً منافق مسلمان بن جائے گا۔

اب رہا میرا ذاتی ردِ عمل تو مَیں ابھی سے کھول کھول کر بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر تو اس اعلان میں "غیر مسلم" کے الفاظ سے آپ کی مراد یہ ہے کہ کوئی مسلمان آپ کے مخصُوص عقائد کو ماننے سے انکار کر دے اور آپ کے استبداد کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہو۔ اگر کفر سے یہ مُراد ہے کہ کوئی محبت کرنے والا اپنے محبُوب آقاؐ کی طرف پھینکے جانے والے اس مکروہ الزام کو ٹھوکریں مارے کہ آپؐ نے معجزات اور قوتِ قدسیہ کی "ناکامی" کے بعد تلوار کے زور سے اسلام کو پھیلایا تھا تو پھر مجھے آج ہی "زمرۂ کفار" میں لکھ لیجئے۔ اور بخدا اگر اِس

کفر کی سزا سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جانے کی بجائے سُولی پر لٹکایا جانا بھی ہو اور ایک مُلک کا اقتدار ہی نہیں رُوئے زمین کی ساری طاقتیں بھی آپ کی مٹھی میں جمع ہوجائیں اور ہولناک مظالم کے بھتنے آپ کی انگلیوں اور پلکوں کے اشاروں پر ناچنے لگیں تو بھی میرا جواب یہی ہوگا کہ :۔

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمّرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم
در کوئے تو اگر سرِ عشاق را زنند
اوّل کسے کہ لافِ تعشّق زند منم

خدا تعالیٰ کے بعد میں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں مخمور ہوں۔ اگر کفر یہی ہے تو خدا کی قسم مَیں سخت کافر ہوں!

ہاں، اے میرے پیارے رسُولؐ، اگر تیرے کُوچہ میں عشاق کا سر قلم کرنے کا ہی دستور جاری ہو۔ تو وہ پہلا شخص جو نعرۂ عشق بلند کرے گا۔ مَیں ہُوں گا مَیں ہُوں گا!